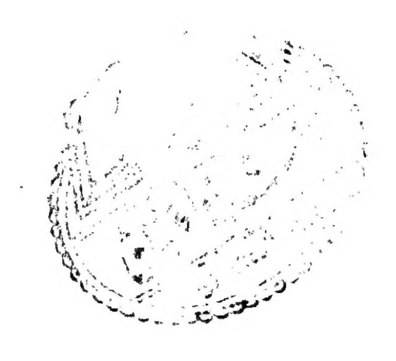


تفسیر معوّذتین
www.KitaboSunnat.com
جادوؤں کا علاج
امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ
امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ
دار الکتب السلفیہ



www.KitaboSunnat.com





دار الکتب السلفیۃ
اقراء سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور
+92 42 373 61 505 - +92 333 43 34 804 - +92 324 43 36 123
darulkutab.al.salafiyyah@hotmail.com
darulkutab.al.salafiyyah@gmail.com



نام کتاب: تفسیر معوذتین حاسدوں کا علاج

مصنف: امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ امام ابن قیم رحمہ اللہ

باہتمام: ھناد شاکر

اشاعت اول: فروری 2011ء

ناشر: دار الکتب السلفیۃ ○ اقراء سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار، لاہور
پوسٹ کوڈ: 54000

+92 42 373 61 505, +92 333 43 34 804
+92 324 43 36 123
darulkutab.al.salafiyyah@hotmail.com
darulkutab.al.salafiyyah@gmail.com

فہرست مضامین

تفسیر معوذتین از امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ



تفسیر معوذتین از امام ابن قیم رحمہ اللہ

باب:۲

باب:۳

تفسیر معوذتین

سورۂ فلق والناس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ تفسیر بھی امام ابن تیمیہ کی ان تحریرات کا حصہ ہے جو آپ نے دوران قید قاہرہ کے قلعہ میں تحریر فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے علوم سے نفع دے۔ آمین

تفسیر سورۂ فلق

فلق کی لغوی تحقیق

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی﴾ (الانعام:٦/٩٥)

''اللہ تعالیٰ دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے۔''

اسی آیت میں فرمایا:

﴿ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ[1] اللَّيْلَ سَكَنًا ﴾ (انعام:٦/٩٦)

---

[1] حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ دانوں اور گٹھلیوں کو پھوڑ کر دانے سے مختلف قسم کی کھیتیاں اور ہر جنس کے دانے سے اناج پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح گٹھلیوں سے طرح طرح کے میوے اور پھل نکالتا ہے۔ جن کے رنگ شکلیں اور ذائقے الگ الگ ہوتے ہیں۔ آگے اس کی خود ہی تفسیر بھی کر دی یُخرِجُ الحَیَّ مِنَ المَیّتِ یعنی زندہ کھیتی اور درخت کو مردہ دانہ اور گٹھلی سے جو ایک جماد اور مردہ بے جان کی مثل ہے، نکال لاتا ہے۔ پھر فرمایا فَالِقُ الاصبَاحِ جس کا مطلب یہ ہے کہ رات کے اندھیرے اور سیاہی کو پھاڑ کر صبح کا اُجالا نمودار کرتا ہے جس سے تمام عالم روشن اور۔۔۔

لفظ فَلَق فعل کے وزن پر مفعول کے معنی میں ہے، لہٰذا رَبِّ الْفَلَقِ کے معنی رَبِّ الْمَفْلُوْق ہوں گے۔ یعنی ہر اس چیز کا رب جو پھاڑ کر نکالی گئی ہو۔ جیسے قبض بمعنی مقبوض آتا ہے، یعنی قبضہ میں رکھی ہوئی چیز۔ چناں چہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ پھاڑ کر نکالتا ہے وہ فلق کہلاتی ہے۔

حسن اس کا معنی یوں بیان کرتے ہیں: جو چیزیں کسی دوسری چیز کے پھٹنے سے پیدا ہوں ان سب کو فلق کہا جاتا ہے، جیسے صبح رات کو پھاڑ کر جب کہ دانہ اور گٹھلی زمین کو پھاڑ کر نکلتے ہیں۔

زجاج نے کہا کہ جب انسان حقائق مخلوقات میں غور کرے گا تو معلوم ہوگا کہ اکثر اشیاء کا وجود کسی دوسری چیز کے پھٹنے سے ہی ہوتا ہے، جیسے زمین سے کھیتیاں اور بادل سے بارش نمودار ہوتی ہے۔

اکثر مفسرین کی رائے ہے کہ فلق سے مراد صبح ہے، دلیل: عرب جب کسی چیز کی تعریف کرتے ہیں تو بولتے ہیں:

هٰذا اَبْيَنُ مِنْ فَلَقِ الصُّبْحِ وَفَرَقِ الصُّبْحِ [1]

"یعنی یہ چیز صبح کی پو پھٹنے سے بھی زیادہ روشن اور واضح ہے۔"

بعض مفسرین کی رائے کے مطابق فلق سے مراد تمام مخلوق ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ فلق جہنم [2] کی ایک وادی یا ایک درخت یا خود جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔

--- مستنیر ہو جاتا ہے۔ ان دونوں آیتوں کے لانے سے شیخ الاسلام کی غرض یہ ہے کہ قرآن کے محاورہ میں فلق کے یہی معنی ہیں۔ قرآن مجید سے استناد کے بعد اہل لغت کے قول سے استشہاد کیا جو آگے مذکور ہے۔

1. تفسیر ابن الجوزی (۲۷۲/۹) تفسیر الطبری (۳۵۰/۳۰)
2. حافظ ابن کثیر نے یہ معنی نقل کر کے کہا کہ اس کی اسناد غریب ہے اور اس کا مرفوع ہونا یعنی آنحضرت ﷺ کا قول ہونا صحیح نہیں۔ ابن جریرؒ نے کہا کہ پہلا قول کہ فلق سے مراد صبح ہے درست ہے۔ یہی صحیح ہے اور اسی کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں پسند کیا۔

یہ قول معنی و مفہوم اور فرمان نبوی ہر دو لحاظ سے درست نہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے ساتھ اسے خاص کرنے میں کوئی حکمت بھی نہیں۔

اس کے برعکس اللہ تعالی کی ربوبیت کو اس کی مخلوق یا دن کی روشنی (جو انسانی ضروریات میں نہایت اہم ہے) کی طرف منسوب کیا جائے تو اللہ تعالی کی شان و کبریائی کا اظہار زیادہ نمایاں ہوتا ہے کیوں کہ اللہ تعالی ہی مخلوق کی جائے پناہ ہے۔

اصطلاحی مفہوم

لفظ فلق کے معنی عام بھی کیے جا سکتے ہیں اور خاص بھی۔ عام [1] سے مراد مخلوق ہوگی کہ ہر مخلوق کے شر سے اور خاص کی صورت میں صبح کے نور پر بولا جائے تو ہر سمت چھائے ہوئے اندھیرے کے شر سے پناہ پکڑی گئی ہے۔

''غاسق'' اور ''وقب''

لفظ ''غاسق'' کے معنی اندھیرا اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ رات پر بھی بولا گیا ہے۔ چناں چہ فرمایا:

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ ﴾

(بني اسرائيل:١٧/٧٨)

''یعنی آفتاب کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک نماز پڑھو۔''

اکثر مفسرین اور اہل لغت اسی کے قائل ہیں۔

---

[1] یعنی فلق کے معنی عام مخلوق لیے جائیں تو ہر مخلوق کی شرارت سے پناہ مانگی جا سکتی ہے۔ اَعُوۡذُ بِرَبِّ الۡفَلَقِ میں مستعاذ بہ چونکہ ہر مخلوق کا خالق اور تمام کائنات پر متصرف ہے اس لیے مستعاذ منہ مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ ہے یعنی ہر مخلوق کی شرارت سے پناہ طلب کی گئی ہے اور اگر فلق کے معنی صرف صبح کا نور لیا جائے تو مستعاذ منہ وَمِنۡ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ہوگا یعنی صبح کے رب سے اندھیرے کی بدی سے جبکہ وہ تمام عالم کو گھیر لیتا ہے پناہ مانگی گئی چونکہ وہ نور کا رب ہے کہ اندھیرے کو پھاڑ کر صبح کا لے آنا اسی کا کام ہے اور نور کے آنے سے ظلمت اپنی تمام برائیوں سمیت کافور ہو جاتی ہے اس لیے اندھیرے کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔

''وقبَ'' کے معنی ہیں ''دَخَلَ فِیْ کُلِّ شَیْئٍ تو مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ'' کے معنی ہوں گے اندھیرے کی برائی سے جبکہ وہ ہر چیز میں داخل ہو جاتا ہے۔

زجاج نے کہا کہ ''غاسق'' کے معنی بارد یعنی ٹھنڈی چیز کے ہیں۔ ایک قول کے مطابق رات کو بھی غاسق کہتے ہیں کیوں کہ یہ دن کی نسبت ٹھنڈی ہوتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کو دیکھا تو فرمایا:

((یَا عَائِشَةُ تَعَوَّذِیْ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّهٖ فَاِنَّهُ الْغَاسِقُ اِذَا وَقَبَ)) ❶

''اے عائشہ! اس کی بدی سے اللہ کی پناہ پکڑ کیونکہ یہی غاسق ہے جب چھا جاتا ہے۔''

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

((اَنَّ الْغَاسِقَ النَّجْمُ)) ❷

''یعنی غاسق سے مراد ستارہ ہے۔''

ابن زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ غاسق ثریا ہے اور ثریا جتنا عرصہ غائب رہتی تھی اتنا عرصہ بیماریاں اور طاعون کثرت سے ہونے لگتی تھیں اور دوبارہ طلوع ہونے پر یہ بیماریاں ختم ہو جاتیں۔ بعض لوگوں نے اس مرفوع تفسیر کو جس میں چاند کا ذکر آیا ہے پہلی تفسیر کے منافی خیال کیا ہے جس میں غاسق کے معنی رات بیان کیے گئے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے مرفوع کو علیحدہ قول ٹھہرایا ہے۔ پھر انہوں نے ''وقوب'' کی تفسیر کسوف کے ساتھ کی ہے۔

ابن قتیبہ نے کہا بعض لوگ چاند کو غاسق اس وقت کہتے ہیں جب گہنا جائے اور سیاہ ہو جائے، لہٰذا ''وقبَ'' کے معنی کرتے ہیں: چاند کسوف میں داخل ہوا۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے، اس لیے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس کا مقابلہ کسی دوسرے قول کے ساتھ کرنا جائز نہیں

---

❶ سنن ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ المعوذتین، رقم: ٣٣٦٦۔ مسند احمد (٢١٥/٦) رقم: ٢٦٣٢٢۔ مستدرک حاکم (٥٤١،٥٤٠/٢)

❷ تفسیر طبری (٢٥٢/٣٠) تفسیر ابن کثیر (٦١١/٤)

اور آپ ﷺ سوائے حق کے دوسری بات نہیں کہتے۔ پھر یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ آپ ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو چاند کے ظہور کے وقت پناہ مانگنے کی تاکید کی ہے نہ کہ جب وہ گہنا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا اٰيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً ﴾ (بنی اسرائیل:۱۷/۱۲)

''ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا ہے، پس رات کے نشان کو ہم نے مٹا دیا اور دن کے نشان کو روشن بنایا۔''

چناں چہ رات کی نشانی چاند اور ستارے ہیں جو رات کے وقت طلوع ہو کر دکھلائی دیتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا چاند سے پناہ مانگنے کا حکم دینا گویا رات کی آیت، رات کی دلیل اور رات کے نشان سے پناہ مانگنے کا حکم دینا ہے۔ چونکہ دلیل کے لیے ضروری ہے کہ مدلول بھی موجود ہو، لہٰذا جب چاند کا شر ہوگا تو رات کا شر بھی ہوگا۔ پھر یہ بھی ہے کہ چاند میں بعض ایسی تاثیرات ہیں کہ دوسری چیز میں نہیں ہوتیں۔ لہٰذا چاند کے وجود سے جو شر حاصل ہوتا ہے اس سے پناہ مانگنا زیادہ قوی ہونا چاہیے۔ ❶

گزشتہ مفہوم کی ایک مثال آپ کے اس فرمان سے سمجھی جا سکتی ہے، کہ جو مسجد تقوی کی بنیاد پر تعمیر کی گئی وہ میری یہ مسجد ہے۔ ❷ حالاں کہ آیت کریمہ میں دوٹوک یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس سے مراد مسجد قباء ہے۔ ❸

---

❶ اس توجیہ سے دونوں اقوال کی تطبیق ہوگئی رات اور چاند میں منافات نہ رہی۔

❷ سنن ترمذی، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب ماجاء فی المسجدالذی اسس علی التقوی، رقم:۳۲۳

❸ مسجد قبا کا واقعہ مسجد ضرار کے ضمن میں اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ آیت والذین اتخذوا مسجدا ضرارا وکفرا سے آخر رکوع تک میں، بیان کیا ہے ان آیات کا سبب نزول یہ ہے کہ مدینہ میں قبیلہ خزرج کا ایک شخص ابو عامر نامی راہب تھا۔ یہ شخص زمانہ جاہلیت میں نصرانی ہوگیا تھا۔ اہل کتاب کے علم سے

بقیہ حاشیہ

واقف اور عبادت گزار تھا۔ قبیلہ خزرج میں اس کی بہت عزت تھی۔ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لائے، تو اس کو بھی اسلام کی دعوت دی اور قرآن سنایا لیکن اس بدبخت نے اسلام سے انکار کیا اور سرکشی اور شرارت پر کمر باندھی۔ جب حضور علیہ السلام کے پاس مسلمانوں کی ایک عظیم الشان جماعت اکٹھی ہوگئی اور صدائے اسلام ہر طرف بلند ہوئی اور بدر میں مسلمانوں کو فتح ہوئی تو ابو عامر کو آگ لگ گئی۔ مدینہ چھوڑ کر مکہ میں پہنچا اور بتدریج قریش کو آنحضرت ﷺ سے برسرِ پیکار ہونے پر آمادہ کرتا رہا۔ چنانچہ اُحد میں جو مسلمانوں کو تکلیف پہنچی تو اسی کی شرارت سے پہنچی۔ آخر کار اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی۔ پھر اُحد کے بعد بھی جب اس نے روز بروز اسلام کا عروج دیکھا تو ہرقل شاہ روم کے پاس پہنچا اور رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ کے لیے اس سے مدد چاہی۔ اس نے اُمید دلائی تو ابو عامر نے منافقین کو خط لکھا کہ عنقریب میں لشکر لے کر رسولؐ سے لڑائی کرنے کے لیے آؤں گا اور فتح ہمیں نصیب ہوگی۔ اب تم میرے لیے ایک ٹھکانا بناؤ تاکہ جو شخص میری طرف سے پیغام لے کر آئے وہاں ٹھہرا کرے۔ اس پر منافقین نے مسجد قبا کے قریب ایک نہایت مستحکم مسجد بنوائی۔ جب وہ تیار ہوچکی تو یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور درخواست کی کہ آپ وہاں چل کر نماز پڑھیں اور ظاہر یہ کیا کہ یہ مسجد ضعیفوں اور بیماروں کے لیے بنائی گئی ہے کہ سردی کی راتوں میں وہاں نماز پڑھ لیا کریں۔ آپؐ اس وقت تبوک کی طرف جارہے تھے۔ آپ نے فرمایا اس وقت تو میں سفر پر ہوں۔ واپسی پر جو اللہ کو منظور ہوگا کیا جائے گا جب آپؐ واپس آئے اور مدینہ سے ایک دن کی مسافت یا اس سے بھی کم رہ گئی تو جبریلؑ نازل ہوئے اور منافقین کی ساری قلعی کھول دی۔ اس پر رسول اللہ نے دو صحابی بھیجے جنہوں نے پہنچ کر مسجد ضرار کو جلا دیا اور منہدم کر دیا۔ اس وقت یہ آیات اُتریں۔ ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

لَا تَقُمْ فِيهِ اَبَدًا ط لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيهِ. فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّوْنَ اَنْ يَتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (سورہ توبہ)

"اس مسجد میں کبھی جا کر کھڑے بھی نہ ہونا، ہاں وہ مسجد جس کی بنیاد شروع سے پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے آپ کا زیادہ حق ہے کہ تم اس میں کھڑے ہوا کرو۔ کیونکہ اس میں ایسے لوگ ہیں جو خوب صاف ستھرا رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ خوب صاف ستھرا رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ آیت اہل قبا کے بارے میں نازل ہوئی یعنی فِيهِ رِجَالٌ الخ لیکن ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اس سے مراد مسجد نبوی ہے جو مدینے کے اندر ہے تو ان باتوں میں کوئی منافات نہیں۔

دوسری مثال: آپ نے جب چند افراد پر اپنی چادر ڈال کر فرمایا تھا[1]: ھٰـؤلاء اھل بیتی. یعنی میرے اہل بیت یہ لوگ ہیں۔[2] حالانکہ قرآن مجید کے الفاظ ازواجِ مطہرات کو بھی شامل ہیں۔ بات یہ ہے کہ کسی انسان کو یا کسی دوسری چیز کو جب کسی صفت کے ساتھ مخصوص کر دیا جاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ خصوصیت اس خاص انسان یا خاص چیز میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ پس جو چیزیں رات میں ہوتی ہیں ان سب میں چاند سے پناہ مانگنا زیادہ مناسب ہے۔ کیوں کہ رات تاریک ہوتی ہے اور رات کو شیاطین الانس والجن اس زور و شور سے پھیل جاتے ہیں کہ دن میں اتنا نہیں پھیلتے اور رات کے وقت طرح طرح کی نافرمانی، بدکاری، احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی، جادو، چوری، خیانت اور بے حیائی وغیرہ کے کام کرواتے ہیں جو عموماً اتنی کثرت سے دن کو نہیں ہوتے۔

لہٰذا شر ہمیشہ ظلمت و اندھیرے کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔ اسی لیے تو اللہ نے رات لوگوں کے سکون اور آرام کے لیے بنائی ہے، لیکن شیاطین الانس والجن رات میں شرارت کے وہ وہ کام کرتے ہیں کہ دن میں ان پر دسترس نہیں پا سکتے۔

---

[1] یہ سورت احزاب کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تطهیرا (سورۃ احزاب:۳۳)
''اے پیغمبرؐ کے گھر والو! خدا کو تو بس یہی منظور ہے کہ تم سے ہر طرح کی گندگی کو دور کر دے اور تم کو ایسا پاک صاف بنائے جیسا کہ پاک صاف بنانے کا حق ہے۔''
حافظ ابن کثیر نے کہا یہ آیت اس امر پر نص ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات اہل بیت میں داخل ہیں۔ کیونکہ آیت کا سبب نزول وہی ہیں اور سبب نزول کو سب سے پہلے دخل ہوتا ہے اور اس کے بعد وہ لوگ بھی داخل ہو سکتے ہیں جن میں ایسے اوصاف پائے جاتے ہیں۔
حدیثوں میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ، علیؓ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہما پر اپنی کملی پھیلائی اور فرمایا ھٰؤُلَاءِ اَهْلُ بَیْتِیْ تو مراد آپ کی یہی ہے کہ یہ لوگ بطریق اولیٰ اہل بیت ہیں۔

[2] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی ابن ابی طالب، رقم: ۳۲۔ سنن ترمذی، رقم: ۳۲۰۵۔ تفسیر ابن جریر (۷/۲۲) مستدرك حاکم (۲/٤١٦)

یہ شیاطین چاند سے دعا کرتے ہیں اسی طرح دیگر عبادات کا ذریعہ بھی اختیار کرتے ہیں۔ ابو معشر بلخی نے ایک کتاب لکھی ہے ،اس کا نام ''مصحف القمر'' رکھا۔ جس میں کفر اور جادوگری کی ایسی ایسی چیزیں مذکور ہیں کہ ان سے پناہ مانگنی چاہیے۔

بالجملہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو عام طور پر تمام مخلوق کے شر سے اور پھر چھائے ہوئے اندھیرے کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا۔ کیوں کہ اس وقت ان کی شرارتیں زیادہ ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد خاص طور پر جادو اور حسد کا ذکر کیا۔ کیونکہ جادو کا کاروبار خبیث لوگ ہی کرتے ہیں جو گرہوں میں پھونکیں مار کر اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح حسد بھی ایسے ہی لوگوں کا کام ہے، کبھی نظر لگاتے ہیں، کبھی زبان اور ہاتھ سے ظلم کرتے ہیں۔ جادو چونکہ عام طور پر عورتوں سے سرزد ہوتا ہے اور حسد عموماً مردوں سے اور کبھی ہر دو قسم یعنی مرد و عورت سے سرزد ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید میں الفاظ بھی اسی مناسبت سے ذکر ہوئے۔

سورۃ فلق والناس کی خصوصیات میں فرق

ارواح خبیثہ خواہ مذکر ہوں یا مونث، سے جو شر پیدا ہوتا ہے وہ انسان کے علاوہ کسی خارجی اثر سے پیدا ہوتا ہے، اس کا وسواس الخناس سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ وہ تو دل کا معاملہ ہے۔ کیونکہ کفر، فسق، عصیان جیسے افعالِ قبیحہ کی ابتداء دل سے ہوتی ہے۔

غرض سورہ والناس میں ایسی چیزوں کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم ہے جو انسان کو کفر، فسق اور نافرمانیوں جیسے نقصان پہنچاتی ہیں، اسی لیے خود اپنے دل میں پیدا ہونے والے شرور سے پناہ مانگنے کا حکم ہے۔

سورۂ فلق میں تمام مخلوقات کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم ہے، اس لیے اس میں بِـــرَبِّ الْفَلَقِ کہا گیا اور سورۂ والناس میں بِرَبِّ النَّاسِ کہا گیا۔

صبح کو پھاڑنے والا روشنی میں پوشیدہ خیر و بھلائی سے تاریکی کی مضرتوں کو دور کرتا ہے۔

نیز دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا گرہوں میں پھونکوں کے اثرات کو بھی دور کر دیتا ہے۔

بالکل اسی طرح حسد کے نتیجہ میں انسان کا دل تنگ اور لالچی ہو جاتا ہے، نیز انعامات الٰہی

کے اظہار کا حوصلہ نہیں رہتا۔ چناں چہ فلق کا رب حاسد کے انقباضِ خاطر اور لالچی پن کو دور کر دیتا ہے۔

سنت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو دوسری چیز سے پھاڑ کر نکالتا ہے وہ چیز خیر و برکت کا موجب ہوتی ہے۔ صبح طلوع کرنے سے راہنمائی کرنے والی روشنی پیدا ہوتی ہے، نیز سورج میں بھی لوگوں کے لیے بے شمار فوائد رکھے ہیں۔ اسی طرح دانوں اور گٹھلیوں کے پھاڑنے سے قسم قسم کے میوہ جات اور انواع و اقسام کے رزق نکالتا ہے جو انسان اور ان کے جانوروں کا رزق بنتا ہے۔

انسان رہنمائی اور رزق کا محتاج ہے جو دن کی روشنی میں ہی حاصل ہوتے ہیں۔ چناں چہ وہ رب الفلق جس نے لوگوں کے لیے مفید اشیاء پیدا فرمائیں اسی رب سے مضرت رساں اشیاء سے بھی پناہ مانگنی چاہیے۔

لہٰذا اس استعاذہ کا نتیجہ اور حاصل یہ ہوا کہ رب الفلق سے اس امر کی طلب اور درخواست کی جائے کہ جس طرح تو نے اپنے بندے پر احسان اور انعام کیے ہیں اسی طرح ضرر رساں چیزوں کو دور کر کے اپنی نعمتیں مکمل کر دے۔

ایک چیز کو دوسری سے نکالنا، زندہ سے مردہ اور اس کے برعکس پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی کمالِ قدرت کی دلیل ہے۔ یہ تو پیدائش کی مثال تھی جب کہ اللہ تعالیٰ مفید چیز سے نقصان دہ چیز کو دور کر دینے پر بھی پوری طرح قدرت رکھتا ہے۔



تفسیر سورۃ والناس

اس سورۃ کی تفسیر میں اہل علم کے متعدد اقوال ہیں۔ابن جوزیؒ نے صرف دو قول ذکر کیے ہیں اور تیسرا ذکر نہیں کیا حالانکہ صحیح وہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آیت نمبر۴ میں مذکور وسوسوں کا تعلق آخری آیت میں مذکور جنوں اور انسانوں کے ساتھ ہے۔

لفظ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ وسواس کا بیان ہے تو تقدیر عبارت یوں ہوگی اَلَّذِىْ يُوَسْوِسُ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ فِي صُدُوْرِ النَّاسِ یعنی جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے وہ جنوں اور انسانوں میں سے ہے۔اس کی دلیل، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَكَذَالِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِىْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ﴾ (انعام:٦/١١٢)

''اور اسی طرح ہم نے شیاطین الانس والجن میں سے ہر نبی کے دشمن بنائے تھے کہ دھوکہ دینے کی غرض سے ایک دوسرے کے کان میں چکنی چپڑی باتیں پھونکتے رہتے۔''

اس وحی یعنی کانوں میں باتیں کرنے سے مراد وسوسہ ہے۔ وسوسہ کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آنکھوں سے پوشیدہ ہو۔ بلکہ آمنے سامنے گفتگو کرتے ہوئے بھی ایسا ممکن ہے۔اس کی دلیل، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِىَ لَهُمَا مَاوٗرِىَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَانَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخَالِدِيْنَ وَقَاسَمَهُمَا اِنِّىْ لَكُمَا مِنَ النَّاصِحِيْنَ ﴾

''پھر شیطان نے دونوں (آدم وحوا) کو وسوسہ میں ڈالا تاکہ ان کے پردہ کرنے کی چیزیں جو ان کی نظر سے مخفی تھیں انہیں کھول دکھائے اور ان کو لگا کہنے تمہارے

پروردگار نے جو اس درخت کے پھل کھانے سے منع کیا ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو تم دونوں فرشتے بن جاؤ اور ہمیشہ یہیں رہو۔ ان سے قسمیں کھا کھا کر بیان کیا کہ بلاشبہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔" (اعراف:۷/ ۲۰،۲۱)

اس گفتگو کا قائل (ابلیس) معروف ہے، اور ایسا بھی نہیں کہ جو بات دل میں ڈالی گئی ہے وہ معلوم نہ ہو سکے کہ کس کی طرف سے ہے۔ ابلیس وہی ہے جسے حکم دیا گیا تھا کہ آدم کو سجدہ کرے، لیکن اس نے انکار کیا اور شیخی میں آ کر اکڑنے لگا، وہ ایسا تو تھا نہیں جسے آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نہ جانتے ہوں۔

یہ سچ ہے کہ شیطان اور اس کی نسل انسان کو وہاں سے دیکھتی ہے جہاں سے وہ ان کو نہ دیکھ سکیں لیکن آدم نے تو شیطان کو بچشم خود دیکھا تھا۔ کبھی کبھی شیاطین اور جنوں کو بہت سے انسان دیکھ بھی لیتے ہیں، تاہم جنوں میں چھپ جانے اور پوشیدہ ہو جانے کی وہ خاصیت ہے جو انسان کو حاصل نہیں۔

مشاہدۂ شیطان کی دوسری دلیل یہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ ﴾ (انفال:۸/ ۴۸)

"اور جب شیطان نے ان کے اعمال اچھے کر دکھائے اور کہنے لگا کہ آج لوگوں میں سے تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں اور میں تمہارا مددگار ہوں، تو جب دونوں گروہ آپس میں آمنے سامنے ہوئے شیطان اُلٹے پاؤں چلتا بنا اور کہنے لگا میں تم سے بیزار ہوں۔"

تفسیر اور سیرت کی کتابوں میں منقول ہے کہ شیطان ان کے پاس کسی آدمی کی صورت میں آیا تھا۔ اسی طرح تیسری دلیل یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّىْ بَرِئٌ مِنْكَ اِنِّىْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعَالَمِيْنَ ﴾ (حشر:۵۹/۱۶)

''جیسے شیطان کی مثال ہے جب اس نے انسان سے کہا کافر ہو جا تو جب اس نے کفر کر لیا کہنے لگا میں تم سے بری ہوں، میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں جو تمام جہاں کا پروردگار ہے۔''

وسوسہ ڈالنے والی تین چیزیں ہیں:

ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَيَاطِيْنِ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ ۔ قُلْتُ اَوَلِلْاِنْسِ شَيَاطِيْنٌ ؟ قَالَ نَعَمْ شَرٌّ مِّنْ شَيَاطِيْنِ الْجِنِّ))[1]

''یعنی ہم انسانوں اور جنوں کے شیطانوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں، میں نے عرض کیا یارسول اللہ کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے آپ نے فرمایا ''ہاں'' جنوں کے شیطانوں سے بدتر۔''

یہ بات بھی تسلیم شدہ ہے کہ انسان کے دل میں وسوسہ آتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ﴾ (ق:۵۰/۱۶)

''ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم جانتے ہیں جو اس کا نفس خیال کرتا ہے۔''

پس یہ انسان کے نفس کی خود اپنے آپ کو وسوسہ ڈالنے کی صورت ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے ''حدیث النفس'' یعنی دل ہی دل میں باتیں کرنا۔

صحیحین میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِاُمَّتِىْ عَمَّا حَدَّثَتْ بِهٖ اَنْفُسُهَا مَالَمْ تَتَكَلَّمْ بِهٖ اَوْ تَعْمَلْ بِهٖ))[2]

---

[1] مسند احمد (۵/۱۷۸، ۱۷۹) رقم: ۲۱۸۷۹و۲۱۸۸۵۔سنن نسائی (۵۵۰۹)

[2] صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب الطلاق فی الاغلاق، رقم: ۵۲۶۹۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تجاوز اللہ عن حدیث النفس، رقم: ۲۰۲

''یعنی اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے ان خیالات سے درگزر کی جو اندر ہی اندر ان کے نفس باتیں کرتے ہیں جب تک ان کو زبان سے نہ بولیں یا جب تک ان کے مطابق عمل نہ کریں۔'' ❶

خلاصہ کلام یہ کہ انسان کے سینے میں وسوسہ ڈالنے والی تین چیزیں ہیں اوّل خود اپنا نفس، دوئم شیاطین الجن، سوئم شیاطین الانس۔

آیت مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ میں جو وسواس خناس کا لفظ ہے، یہ نہ صرف جن کے وسوسہ کو شامل ہے۔ بلکہ انسانی وسوسہ کی دونوں قسموں یعنی اپنے دل کے خیالات اور دوسرے لوگوں کے ڈالے ہوئے وسوسہ کو بھی شامل ہے، ورنہ محض جن کے وسوسہ سے پناہ مانگنے کے کیا معنی؟ اپنے دل کا اور شیاطین الانس کا وسوسہ ہر کسی کے حق میں ایک جیسے نقصان دہ ہیں۔ بلکہ اندرونی وسوسہ کبھی جن کے وسوسہ سے بڑھ کر مضرت رساں ثابت ہوتا ہے۔

فراء نحوی کا قول اور اس کی تضعیف

اُوپر بیان ہو چکا کہ لفظ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاس. يُوَسْوِسُ کا بیان ہے اور یہی صحیح ہے۔ لیکن فراء کہتا ہے کہ صُدُور الناس میں جو ناس ہے یہ اس کا بیان ہے۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ کیے جائیں گے کہ اس وسواس خناس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ وہ لوگ جن کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے دو گروہ ہیں: جنوں کا گروہ اور انسانوں کا گروہ۔

نیز فراء کہتا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جن کے لیے بھی ناس کا لفظ استعمال فرمایا۔ یعنی ناس کے مسمی میں دونوں فریق جن اور انسان داخل ہیں، جیسے سورہ جن کی آیت میں:

﴿ وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ ﴾(الجن:٧٢/٦)

---

❶ یعنی محض دل کے خیالات پر مواخذہ نہیں ہاں اگر ان بے ہودہ خیالات کو زبان پر لے آئیں یا ناجائز خیالات کو عمل کا جامہ پہنادیں تب ان پر بولنے اور عمل کرنے کی وجہ سے مواخذہ ہوگا۔

ان کا نام رِجَالٌ رکھا۔اسی سورہ کی دوسری آیت میں:

﴿ قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِنَ الْجِنِّ ﴾ (الجن:۷۲/۱)

سورۂ احقاف کی آیت میں:

﴿ وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفَرًا مِنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ﴾

(الاحقاف:۴۶/۲۹)

ان کا نام نفرٌ رکھا۔

لیکن فراء کا قول ضعیف ہے۔ضعف کی پہلی وجہ:

ناسٌ کی تقسیم جن وانس کی صورت میں کرنے کی بجائے یہ لفظ اپنے حقیقی معنی ومفہوم میں زیادہ ظاہر اور مشہور ومعروف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ناس کا لفظ ایک سے زیادہ مقام پر استعمال کیا ہے، جہاں جن اور انس کی طرف اس کی تقسیم کی کوئی صورت نہیں۔

دوسری وجہ: (اگر فراء کا یہ قول صحیح مانا جائے) تو مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ وسواس کی صفت توضیح اور صفت بیان ہوگا۔یعنی وہ وسواس جس کی صفت یہ ہے کہ (جنوں اور انسانوں) دونوں گروہوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے، حالانکہ جنوں کا وسوسے کا شکار ہونا لوگوں کے نزدیک معروف نہیں۔ اس کی معرفت تو (شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی) خبر سے ہی ہوسکتی ہے، جب کہ یہاں کوئی خبر بھی موجود نہیں۔

تیسری وجہ: اللہ تعالیٰ نے جو مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ فرمایا ہے اس میں ناس کا لفظ عام معنی میں مستعمل ہو کر جنوں اور انسانوں کو شامل کیونکر ہوسکتا ہے اور یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ کسی چیز کو تقسیم کرنے والا خود اس کا حصہ بھی ہو۔

فراء ''ناس'' کو ایک طرف تو جن کا قسیم ٹھہراتا ہے اور دوسری طرف جن کو ''ناس'' کی ایک قسم بناتا ہے۔اس کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے کہ کوئی شخص کہے:

اَكْرِمِ الْعَرَبَ مِنَ الْعَجَمِ وَالْعَرَبِ .

''یعنی عربی کی خاطر تواضع کر خواہ وہ عربی آدمی عجم کا رہنے والا ہو یا عرب کا۔''

تو کیا کوئی سمجھدار یہ بات کہہ سکتا ہے؟

فراء کے استشہاد کا جواب:

اللہ تعالیٰ نے جوان کو رِجَـالٌ کہا، تو اس میں ایسی کوئی دلیل نہیں کہ ان کو ''ناس'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ جنوں کو بھی بعض اوقات ''ناس'' کہا گیا ہے، چنانچہ بولا کرتے ہیں:

جَاءَ نَاسٌ مِنَ الْجِنِّ۔

''یعنی جنوں میں سے کچھ لوگ آئے۔''

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی گفتگو میں قید لگا کر تو بولا جا سکتا ہے بغیر قید کے عام لفظ کہیں نہیں بولا گیا۔ اس قسم کی مثال تو لفظ ناس میں بھی دی جا سکتی ہے:

اِنْسَانٌ مِّنْ طِيْنٍ وَّمَاءٍ دَافِقٍ۔

''یعنی انسان مٹی اور ٹپکنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔''

اس کا یہ معنی قطعاً نہیں کہ ماء اور طین سے ناس مراد لیا جا سکتا ہے۔

لیکن مطلق انسان کا لفظ بول کر طین اور ماء مراد لینا جائز نہیں اور اس جَاءَ نَاسٌ مِنَ الْجِنِّ کے جواز سے یہ لازم نہیں آتا کہ جن مطلق لفظ ناس میں بھی داخل ہوں۔

لفظ ''ناس'' آدم اور بنو آدم کے لیے خاص ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿يَـا اَيُّهَـا الـنَّـاسُ اتَّـقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ (النساء:٤/١)

''لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو تن واحد (یعنی آدمؑ) سے پیدا کیا اور اسی (ایک جان سے) اس کی بیوی (حوا) کو پیدا کیا۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام وحوا علیہا السلام کی ساری اولاد کو ''ناس'' کہا جاتا ہے۔ البتہ

اس موقع پر اللہ تعالیٰ جن اور انسان دونوں گروہوں سے مخاطب ہے، نیز رسول اللہ ﷺ بھی ان دونوں جماعتوں کی طرف بھیجے گئے تھے۔ لیکن اس سب کے باوجود لفظ ''ناس'' انسانوں ہی کے ساتھ خاص ہے جنوں کو شامل نہیں، بلکہ جنوں کو خطاب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ان کا نام صراحتاً لیتا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ﴾

''اے جنوں اور انسانوں کے گروہ۔''

زجاج نحوی کا قول اور اس کا رد:

زجاج نے ﴿ من شر الوسواس الخناس ﴾ آیت کا یوں معنی کیا ہے:

''وسواس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو جن میں سے ہے اور آدمیوں کے شر سے بھی۔''

لیکن جس طرح فراء کا قول ضعیف ہے اسی طرح زجاج کا قول بھی ضعف سے خالی نہیں۔ اگر چہ یہ فرا کے قول سے زیادہ راجح اور بہتر ہے، کیوں کہ جنوں کا شر تو آدمیوں کے شر سے بہت بڑا اور بدتر ہوتا ہے، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پناہ مانگنے والا تمام انسانوں کے شر سے تو مطلقاً پناہ مانگے لیکن جنوں کی باری بعض جنوں کے شر سے پناہ مانگی جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر وسواس الخناس کا تعلق صرف جنوں سے ہے، تو پھر مِنَ النَّاسِ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لہٰذا انسانیت کے وسوسہ کے ذکر میں جنوں کا بطور خاص ذکر کیا گیا کہ ان سے بھی پناہ مانگنی ضروری ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ جب معطوف سے پہلے دو اسم ہوں تو قریب تر پر عطف کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے ضمیر کا مرجع قریب ترین کو بنانا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہاں کوئی ایسی دلیل نہ ہو جو بعید پر عطف ڈالنے کی متقاضی ہو۔

چناں چہ اس قاعدہ کی بنا پر ''الناس'' کا عطف ''الجنة'' پر ڈالنا اولیٰ ٹھہرا بہ نسبت اس کے کہ ''الوسواس'' پر اس کو معطوف ٹھہرایا جائے۔

فراء اور زجاج کے قول کی مشترک وجہ ضعف:

سب وجوہ سے قطع نظر ان ہر دو اقوال کی تضعیف کے لیے صرف اتنی ہی بات کافی ہے کہ تمام مسلمان رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے لے کر آج تک اس سورۃ کو پڑھتے آئے ہیں اور سوائے بعض نحویوں کے اور کسی سے بھی یہ درج بالا مفہوم منقول نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام میں سے کوئی بھی اس قسم کی بات نہیں کرتا۔ بلکہ ان سے وہی اقوال مذکور ہیں جو ہمارے ذکر کردہ مفہوم کی تائید میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

چنانچہ معمر کی تفسیر میں ہے کہ مفسر تابعی قتادہ نے مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ کی تفسیر میں کہا:

"جنوں اور انسانوں دونوں میں شیطان ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم انسانوں اور جنوں کے شیاطین سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔"

گویا یہ کہہ کر قتادہؒ نے یہ بات ثابت کر دی کہ اس سورۃ مبارکہ میں شیاطین الانس والجن سے پناہ مانگنے کا تذکرہ ہو رہا ہے۔

ابن وہب نے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ سے الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاس کی تفسیر ان الفاظ میں بیان کی ہے: خناس اسے کہتے ہیں جو کبھی وسوسہ ڈالتا اور کبھی دبک کر بیٹھ جاتا ہے، یہ خناس جنوں سے بھی ہوتا ہے اور انسانوں سے بھی۔ چناں چہ درج بالا تشریح سے معلوم ہوا کہ خناس جن اور انسان دونوں جنسوں سے ہوتا ہے۔

یہ بات معلوم ومشہور ہے کہ انسان نما شیطان جنوں والی قسم کے شیاطین سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں، کیوں کہ ان شیطان کو وسوسہ ڈالتے ہوئے کوئی نہیں دیکھ سکتا، لیکن انسان نما شیاطین کھلے عام وسوسے ڈالتے اور گمراہی پر مجبور کرتے ہیں۔

ابن جریج (تابعی) سے منقول ہے کہ من الجنة والناس سے مراد دو قسم کے وسوسے ہیں۔ جن کے وسوسہ کی تعیین لفظ خناس سے کی گئی، جب کہ انسانی وسوسہ کو اس کے اپنے دلی خیالات سے تعبیر کیا گیا۔

یہ تیسرا قول اگر چہ زجاج کے قول کے مشابہ ہے لیکن اس سے بہتر اور اچھا ہے۔ کیوں کہ

ابن جریج نے انسانی وسوسہ کی تعبیر اپنے دلی خیالات سے کی ہے یہ معنی ہمارے نزدیک عمدہ ہے۔ یہ تینوں اقوال امام ابن ابی حاتمؒ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیے ہیں۔

قول منصور کی تائید ایک اور وجہ سے:

امام ابن ابی حاتمؒ اپنی تفسیر میں یہ بات بھی ذکر کرتے ہیں کہ اس سورۃ کی ابتدائی تین آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی تین صفتوں کا ذکر ہے:

① ...... رَبِّ النَّاس ② ...... مَلِكِ النَّاسِ ③ ...... اِلٰهِ النَّاسِ.

پس اگر مقصود یہ ہو کہ لوگ اپنے رب، اپنے بادشاہ اور اپنے معبود کی پناہ لیں ہر اس چیز کے شر سے جو انسان کے سینے میں وسوسے ڈالتی ہے۔ تو بالکل صحیح ہے کیونکہ وہی ذات تو ہے جس سے ہر خیر اور بھلائی جو لوگوں کے حق میں مفید ہو سکتی ہے طلب کی جاتی ہے، اسی طرح نقصان دہ اشیاء کے اثرات دور کرنے کی درخواست بھی اسی سے کی جا سکتی ہے۔

چناں چہ وسوسہ ہر برائی کی جڑ ہے، اسی وسوسے کے نتیجے میں انسان گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور یہی عادات اسے فاسق بنا دیتی ہیں اور آخر کار کفر تک بھی لے جاتی ہیں۔ رب تعالیٰ کی سزائیں تو بندوں کے اپنے گناہوں کا نتیجہ ہوتی ہیں، اور اگر کسی بندہ سے کوئی گناہ سرزد ہی نہ ہو تو آنے والی مصیبت اس کے حق میں سراسر نعمت ہو جاتی ہے، بلندی درجات کا سبب اور آخرت میں اجر کا حق دار بنا دیتی ہے۔

یہ اس صورت میں ہوگا جب فرض کر لیا جائے کہ مطلقاً فلاں آدمی سے کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوا، لیکن امر واقع یہ ہے کہ ایسا ہو نہیں سکتا، کیوں کہ حدیث میں ہے:

((كُلُّ بَنِيْ اٰدَمَ خَطَّآءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّآئِيْنَ التَّوَّابُوْنَ)) [1]

''یعنی سب بنی آدم خطا کار ہیں اور خطا کاروں میں بہترین لوگ وہ ہیں جو کثرت سے توبہ کرنے والے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] سنن ترمذی، کتاب الزھد، باب فی استعظام المؤمن ذنوبه، رقم: ٢٤٩٩

﴿ وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ﴾ (احزاب:۳۳/۷۲،۷۳)

''انسان نے امانت (احکامِ شریعت کی بجا آوری کی ذمہ داری) کو اُٹھایا، اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا ہی ظالم اور بڑا ہی نادان تھا۔ تا کہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو عذاب دے اور مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں پر (رحمت سے) رجوع کرے (یعنی وہ توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرے)۔''

انبیاء وغیر انبیاء یعنی مومنین بھی اللہ تعالی کے حضور توبہ کے لیے دست بدعا رہتے تھے، آدم (علیہ السلام) کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَتَلَقّٰى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾

(بقرہ:۲/۳۷)

''آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات حاصل کر لیے تو اللہ تعالیٰ نے (اپنی رحمت سے) اس پر رجوع کیا بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔''

نیز نوح علیہ السلام کی دعا:

﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَاِلَّا تَغْفِرْلِيْ وَتَرْحَمْنِيْ اَكُنْ مِّنَ الْخَاسِرِيْنَ ۝ ﴾ (ھود:۱۱/۴۷)

''عرض کیا اے میرے رب! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسے امر کے بارے میں تجھ سے سوال کروں جس کے اچھا ہونے کا مجھے علم نہیں اور اگر تو مجھے نہ بخشے اور مجھ پر رحم نہ کرے تو میں خسارہ پانے والوں سے ہو جاؤں گا۔''

ابراہیم واسماعیل علیہما السلام کی دعا:

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا

مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴾ (بقرہ:۲/۱۲۸)

''اور اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں کو اپنا (بندہ) فرمانبردار بنا اور ہماری نسل میں ایک گروہ (پیدا کر) جو تیرا حکم بردار ہو اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر بے شک تو بڑا ہی درگزر کرنے والا مہربان ہے۔''

موسیٰ علیہ السلام کی دعا:

﴿ أَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِينَ ﴾ (اعراف:۷/۱۵۵)

''(اے رب) تو ہمارا کارساز ہے ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔''

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس قسم کی دعائیں بہ کثرت منقول و معروف ہیں۔

ہم اپنے اصل مدعا کی طرف آتے ہیں کہ ہر برائی کی جڑ وسوسہ ہی ہے۔لہٰذا اگر لوگ وسوسہ کے شر سے اپنے رب، اپنے بادشاہ اور اپنے معبود کی پناہ لیں تو اس میں جن اور انسان دونوں کے وسوسے شامل ہو جائیں گے۔

انسان کو پہنچنے والی ہر طرح کی مصیبت تو ان کی اپنی شامتِ اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جنوں کی طرف سے وسوسہ کے علاوہ بھی تو نقصانات درپیش رہتے ہیں اور ناگہانی بلائیں آسمان سے اترتی ہیں۔ایسے حالات میں سورۃ فلق کے مضمون کی طرح صرف مخلوق کی شرارتوں سے کوئی بھی پناہ نہیں مانگتا۔بلکہ یہاں مقصود انسان کے دل میں پیدا ہونے والے غلط خیالات ہیں،اگرچہ ''رب الناس، ملک الناس، الٰه الناس'' کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس لیے کہ لوگ اس کے ساتھ پناہ مانگیں تا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو دوسرے شریر لوگوں سے پناہ دے۔

یہ استعاذہ دونوں باتوں کو شامل ہے۔ان باتوں کے حصول کی صورت یہ ہے کہ اس ربّ، ملک معبود کی، اس وسواس کے شر سے پناہ مانگی جائے جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔کیوں کہ ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی ایک دوسرے پر سرکشی و بغاوت اور دھوکہ دہی کے

وسوسے بھی اسی جانب سے پیدا ہوتے ہیں۔

جو بدی اور شرارت کسی انسان کو دوسرے انسان سے پہنچتی ہے اس کی ابتداء بھی وسواس خناس ہی کی طرف سے ہوتی ہے، اگر اس کی ابتداء وسواس خناس کی طرف سے نہ ہو تو ممکن ہی نہیں کہ کسی کو دوسرے سے ایذا پہنچے۔

بلکہ جو وحی اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کے ذریعے بھیجی، حالاں کہ وہ عدل پر مبنی ہے، مثلاً حدود شرعیہ کا قیام، کافروں سے جہاد اور ظالموں سے قصاص لینا وغیرہ، ان امور میں اگرچہ ایذا اور تکلیف ہے جو کسی انسان کو پہنچتی ہے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی وحی ہے اس کا وسواس سے کوئی تعلق نہیں۔ اقامت حدود دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں کے حق میں نعمت ہے۔ حتی کہ جسے سزا دی جا رہی ہے اس کے حق میں بھی نعمت ہے، کیوں کہ جب اس کو سزا مل گئی تو اگر وہ مومن تھا تو یہ سزا اس کے حق میں گناہ کا کفارہ ہو جاتی ہے۔ بصورت دیگر کم از کم اس کے لیے آخرت کے عذاب میں دنیاوی سزا کے مطابق تخفیف کا باعث ضرور ہوگی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا رحمۃ للعالمین ہونا:

یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا لقب رحمۃ للعالمین ہے، کیوں کہ مختلف اعتبار سے آپ تمام جہاں کے حق میں رحمت ہیں، اسی طرح مؤمنین کو دنیا و آخرت میں جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ان کا سبب بھی آپ کی ذات بابرکت ہے، پھر آپ سراپا رحمت ہی رحمت ہیں۔ جو آپ پر ایمان لایا اس نے اس رحمت کو حاصل کر لیا ورنہ وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے۔

اس اعتبار سے بھی آپ رحمۃ للعالمین ہیں کہ آپ نے کافروں اور منافقوں کا قلع قمع کر کے ان کی شرارتوں کو کم کر دیا اور وہ ایسی حرکتوں کے قابل ہی نہ رہے۔ ان میں سے کچھ تو قتل کر دیے گئے کیوں کہ ان کا زیادہ عرصہ تک زندہ رہنا خود ان کے لیے اور ساری انسانیت کے حق میں نقصان کا باعث تھا لہٰذا ان کی بروقت موت سب کے لیے مفید ثابت ہوئی۔

چناں چہ محمد ﷺ ہر لحاظ سے رحمۃ للعالمین ہیں، لہٰذا لفظ ''ناس'' میں اگرچہ انبیاء عظام اور ان کے صحابہ کرام کا شمار ہوتا ہے لیکن ان کے وجود گرامی سے پناہ نہیں مانگی جاتی۔ گویہ بھی

اپنے دشمنوں کے حق میں ایذا کا باعث ہوتے ہیں۔ الغرض اسی انسان سے پناہ مانگی جائے گی جو لوگوں میں وسوسے پیدا کرتے ہیں۔

اس تقدیر پر رب الناس، ملک الناس، الٰہ الناس کی پناہ لی جاتی ہے۔ وسواس کے اس شر سے جس کا وہ پناہ مانگنے والے اور تمام لوگوں کو وسوسہ ڈالتا ہے تاکہ ان کی طرف سے پناہ پکڑنے والے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

جب لوگوں کے لیے وسواس کے علاوہ دوسرے کسی شر کا وجود ہی نہیں تو وسواس سے استعاذہ ہی دراصل مطلوب ومقصود ہوگا۔ اس تشریح وتفصیل سے اس کا مفہوم نہایت متوازن صورت میں واضح ہوتا ہے اور انبیائے کرام اور اولیاء اللہ بھی وسواس کے مفہوم سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اُس صورت میں جنوں کی انسانوں پر فضیلت و برتری ثابت ہوتی تھی جسے کوئی سمجھ دار آدمی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

سوال: اگر کوئی شخص اعتراض کرے کہ جب سارے کے سارے شر کی بنیاد وہی ہے جو وسواس ''خناس'' سے پیدا ہوتی ہے تو پھر انسانوں کے وسوسہ سے پناہ مانگنے کا کیا مطلب؟ کیوں کہ انسانوں کا وسوسہ تبعاً جنوں کے وسوسے کے ماتحت ہے۔

جواب: وسوسہ کی دو قسمیں ہیں: وسوسہ کی ایک قسم جنوں کی طرف سے پیدا ہوتی ہے، جب کہ دوسری قسم خود انسانوں کے نفوس سے تعلق رکھتی ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ﴾ (ق: ۵۰/۱۶)

لہٰذا شر دونوں جہتوں یعنی جنوں اور انسانوں سے واقع ہوسکتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے جنوں کی قسم میں شیطانوں کا کردار ہوتا ہے۔

وسوسۃ کو وشوشۃ بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس کا استعمال ان معنوں میں ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے کے کان میں آہستہ آواز میں بات کرے۔ اسی طرح وَسْوَسَۃُ الْحُلِیِ یعنی زیور کی نرم سی آواز، بھی اسی معنی میں ہے۔ لیکن یہ صرف سین کے ساتھ مستعمل ہے۔

ربّ الناس کی تفسیر:

''ربّ الناس'' وہ ہے جو اپنی قدرت مشیئت اور تدبیر کے ساتھ لوگوں کی تربیت کرتا ہے، وہی ربّ العالمین ہے یعنی تمام جہان اور کل خلقت کا رب۔ پس تمام مخلوق کا خالق بھی وہی ہے اور لوگوں کے اعمال کا پیدا کرنے والا بھی۔

ملک الناس کی تفسیر:

''ملک الناس'' وہ ہے جو لوگوں کو حکم دیتا اور کسی کام سے منع کرتا ہے۔ بادشاہ اپنے احکامات کی بنیاد پر بادشاہی چلاتا ہے، جب کہ جمادات (بے جان چیز) کا کوئی بادشاہ نہیں ہوتا کیوں کہ وہ کسی کا خطاب نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ جمادات کا مالک ضرور ہوتا ہے۔

''ملک'' یعنی بادشاہ اسی چیز کا ہوسکتا ہے جو اس کی بات کو سمجھ سکے، حیوانات چوں کہ آپس میں ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نمل میں حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قول نقل فرمایا:

﴿ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ ﴾ (النمل:۲۷/۱۶)

''ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی۔''

سورۂ نمل میں مزید فرمایا:

﴿ قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ﴾ (النمل:۲۷/۱۸)

''ایک چیونٹی بولی، اے چیونٹیو!''

اس سے معلوم ہوا کہ حیوانات جس کا خطاب سمجھتے ہوں اگرچہ وہ ان کا ہم جنس ہو یا غیر جنس سے ہو وہ ان کا بادشاہ ہوسکتا ہے، جیسے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ان کے بادشاہ تھے۔

الٰہ الناس کی تفسیر:

الٰہ وہ معبود ہے جو (عابد کے) تمام ارادوں اور تمام اعمال کا حقیقی مقصود ہو، جیسا کہ اس موضوع پر اس کے مناسب مقام میں شرح و تفصیل کے ساتھ گفتگو ہوچکی ہے۔

ربّ، ملک، الٰہ کو ناس کی طرف منسوب کرنے میں حکمت:

بعض علماء نے کہا ہے کہ خصوصیت کے ساتھ ''ناس'' کا ذکر کرنا دو باتوں کے لیے ہے:

ایک یہ کہ انسان ہی پناہ مانگنے والے ہیں۔

دوم یہ کہ انہی کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔

ان دونوں باتوں کو ابن جوزیؒ نے ذکر کیا ہے لیکن اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ کیوں کہ جن کا وسوسہ بھی بہت بڑا ہوتا ہے لیکن اس کا ذکر نہیں فرمایا۔

دراصل بات یہ ہے کہ ''ناس'' کو اس لیے ذکر کیا ہے کیوں کہ پناہ مانگنے والے وہ خود ہیں۔ چناں چہ وہ اپنے ربّ کی پناہ پکڑتے ہیں جو ان کو حفاظت میں رکھتا ہے۔ اپنے بادشاہ کی پناہ پکڑتے ہیں جو ان کو حکم دیتا اور کسی کام سے منع کرتا ہے۔ اپنے الٰہ کی پناہ پکڑتے ہیں جس کی وہ عبادت کرتے ہیں۔ اس شخص کے شر سے پناہ مانگتے ہیں جو ان میں اور ان کے رب، ملک اور الٰہ کی عبادت میں حائل اور رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اسی طرح اس وسوسہ کے شر سے بھی پناہ مانگتے ہیں جو خود ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، اس کا سبب انسان اور جن دونوں ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ شر کی اصل انسان ہی ہے یہیں سے اس کا صدور ہوتا ہے اور انہی پر اس کے برے نتائج مترتب ہوتے ہیں۔

بہترین استعاذہ سورۂ فلق والناس میں ہے:

اس تقریر سے کئی ایک خصوصیات واضح ہوئیں جو اس استعاذہ اور اس سے قبل سورۃ فلق کے استعاذہ میں موجود ہیں۔ جیسا کہ اس کے متعلق نبی ﷺ سے احادیث بھی منقول ہو چکی: آپؐ نے فرمایا:

((اَنَّهٗ لَمْ يَسْتَعِذِ الْمُسْتَعِيْذُوْنَ بِمِثْلِهِمَا))[1]

''یعنی پناہ مانگنے والوں نے کبھی کسی چیز کے ساتھ پناہ نہیں پکڑی جو (تاثیر استعاذہ میں) ان دونوں سورتوں کی مثل ہو۔''

---

[1] سنن نسائی، کتاب الاستعاذة، باب ماجاء في سورتي المعوذتين، رقم: ٥٤٤٠۔ سنن دارمي، كتاب فضائل القرآن، باب في فضل المعوذتين

کیوں کہ ہر کفر، فسق اور عصیان کی جڑ اور اصل وسواس ہی ہے۔اور وہی تمام شرور کی اصل ہے۔ جب انسان وسواس کے شر سے بچالیا گیا تو دوزخ اور قبر کے عذاب سے اور زندگی اور موت اور مسیح دجال کے فتنے سے بھی بچ جائے گا۔ کیوں کہ یہ سب عذاب اور فتنے وسواس کی راہ سے ہی انسان کو پہنچتے ہیں۔اس طرح آدمی دنیا وآخرت میں ہر قسم کے عذابِ الٰہی سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کو عذاب تو محض گناہوں کی وجہ سے ہوگا اور گناہوں کا سبب وسواس ہی ہے۔

پھر اگر آیت میں پناہ مانگنے والے کے سوا کسی غیر کا وسوسہ شامل ہو، بایں طور کہ پناہ مانگنے والے کے قول مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ سے مراد وہ وسواس ہے جو اسے خارج سے پہنچتا ہے اور جس سبب سے پہنچتا ہے تو اسے لوگوں کے ظلم بچالیا جائے گا۔اور اگر پناہ مانگنے والے کی مراد خود اپنے اندرونی وسوسہ کی ہو (تو بھی یہی نتیجہ حاصل ہوگا) کہ اسے گناہوں سے بچالیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَوَلَمَّا اَصَابَتْكُمْ مُصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ﴾ (آل عمران:٣/١٦٥)

”کیا جب تم مسلمانوں پر (جنگ اُحد کی شکست کی) مصیبت آ پڑی۔ حالانکہ تم (جنگ بدر میں) اس سے دونی مصیبت (اپنے دشمنوں پر) ڈال چکے ہو تو (بھی) تم لگے کہنے کہ (یہ آفت کہاں سے آ گئی) اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہو کہ یہ تمہارے اپنے (کیے) سے آئی۔“

2: ﴿ وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ ﴾(شوریٰ:٤٢/٣٠)

”اور تم پر جو مصیبت پڑی ہے تو تمہارے اپنے ہی کرتوت سے۔“

3: ﴿ مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ﴾ (النساء:٤/٧٩)

”(اے بندے) تجھ کو کوئی فائدہ پہنچے تو (سمجھ کہ) اللہ کی طرف سے ہے اور تجھ کو

کوئی نقصان پہنچے تو (سمجھ کہ) تیرے نفس کی طرف سے ہے۔"

وسوسہ گفتگو اور کلام کی جنس سے ہے، اسی لیے مفسرین نے اللہ تعالیٰ کے قول ﴿ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ﴾ (ق:۵۰/۱۶) کی تفسیر میں کہا ہے (مَا تُحَدِّثُ بِهِ نَفْسُهُ) یعنی نفس کا وسوسہ وہ ہے جو انسان کا نفس اپنے آپ میں باتیں کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ لِأُمَّتِي مَا تَحَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسُهَا مَا لَمْ تَتَكَلَّمْ بِهِ أَوْ تَعْمَلْ بِهِ))

"یعنی اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے لیے ان چیزوں سے درگزر کی جو ان کے نفس دل ہی دل میں باتیں کرتے ہیں۔ جب تک وہ باتیں زبان پر نہ لائیں اور ان پر عمل نہ کریں۔" ❶

وسوسہ یا حدیث نفس کی تقسیم:

حدیث نفس کی دو قسمیں ہیں:

①......خبر ②......انشاء

پھر خبر کی دو قسمیں ہیں: یا تو گزشتہ واقعہ کی خبر ہوگی یا آئندہ واقع ہونے والے امر کا بیان۔ چناں چہ گزشتہ خبر تو شیطان انسان کو یاد دلاتا ہے اور آئندہ واقع ہونے والے امر کے متعلق اس سے باتیں کرتا ہے کہ تو فلاں فلاں کام کرے گا یا ایسا ایسا کرے گا یا اللہ کی تقدیر سے یہ امور واقع ہوں گے، پس یہ آرزوئیں اور جھوٹے وعدے ہیں۔

انشاء کی تین قسمیں ہیں:

①......امر ②......نہی ③......اباحت

یعنی کسی کام کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور کسی کے نہ کرنے کا، کسی کے متعلق کہتا ہے یہ تجھے مباح ہے اس کی پروانہ کر۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب الطلاق فی الاغلاق، رقم:۵۲۶۹۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تجاوز الله عن حدیث النفس، رقم:۲۰۲

شیطان کے وسوسہ کی ایک اور قسم:

شیطان کبھی تو برائی کی باتوں کا وسوسہ ڈالتا ہے۔ کبھی نیک کام بھلا دیتا ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنی باتوں میں مشغول ہو کر کسی نیک کام جو اسے کرنا ہو بھول جاتا ہے۔ اسی نسیان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (انعام:٦/٦٨)

''یعنی اگر کبھی تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ظالم لوگوں کے پاس مت بیٹھو۔''

موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہم سفر نوجوان نے موسیٰ سے کہا تھا:

﴿ فَاِنِّیْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ وَمَا اَنْسَانِيْهُ اِلَّا الشَّيْطَانُ ﴾ (کہف:١٨/٦٣)

''میں آپ سے مچھلی کا ذکر کرنا بھول گیا اور مجھے سوائے شیطان کے اور کسی نے نہیں بھلایا۔''

سورہ یوسف علیہ السلام میں ہے:

﴿ فَاَنْسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهٖ ﴾ (یوسف:١٢/٤٢)

''یعنی شیطان نے اس کو اپنے آقا کے پاس اس کا ذکر کرنا بھلا دیا۔''

صحیحین میں ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا اَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ اَدْبَرَ الشَّيْطَانُ وَلَهٗ ضُرَاطٌ حَتّٰی لَا يَسْمَعَ التَّاْذِيْنَ فَاِذَا قُضِیَ التَّاْذِيْنُ اَقْبَلَ فَاِذَا ثُوِّبَ بِالصَّلٰوةِ اَدْبَرَ فَاِذَا قُضِیَ التَّثْوِيْبُ اَقْبَلَ حَتّٰی يَخْطُرَ بَيْنَ الْمَرْءِ وَنَفْسِهٖ فَيَقُوْلُ اذْكُرْ كَذَا اُذْكُرْ كَذَا لِمَا لَا يَذْكُرُ حَتّٰی يَظِلَّ الرَّجُلُ لَمْ يَدْرِ كَمْ صَلّٰی.))[1]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب فضل التاذین، رقم:٦٠٨۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب فضل الاذان وھرب الشیطان عند سماعه، رقم:١٩

''جب مؤذن اذان دیتا ہے تو شیطان پیٹھ کے بل بھاگ جاتا ہے اور زور سے گوز لگاتا ہے تاکہ اذان اس کے کان میں نہ پہنچے، جب اذان ختم ہو جاتی ہے تو پھر (اپنے کام وسوسہ ڈالنے کے لیے) آ جاتا ہے، پھر جب اقامت ہوتی ہے تو پہلے کی طرح پیٹھ کے بل بھاگ جاتا ہے، جب اقامت بھی ہو چکتی ہے تو پھر آ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان اور اس کے نفس کے مابین ہو کر جو باتیں اسے بھولی ہوئی تھیں ان کے متعلق کہتا ہے فلاں بات یاد کر فلاں بات یاد کر۔ حتیٰ کہ انسان انہی باتوں میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ اس کو خبر تک نہیں رہتی کہ کتنی رکعتیں پڑھیں۔''

شیطان نے انسان کو گزشتہ واقعات یاد دلائے جو اس کے دل میں تھے، دل میں کچھ اپنے اور کچھ دوسروں کے کام ہوتے ہیں جن کی طرف شیطان متوجہ کروا کے آدمی کو بھلا دیتا ہے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھیں۔ کیوں کہ نسیان انسان کی یادداشت کو زائل کر دیتا ہے اور دوسرے کام میں مصروف کر کے پہلی بات بھلا دیتا ہے۔

مستقبل کے جھوٹے وعدے اور باطل آرزوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ ﴾ (ابراهيم:١٤/ ٢٢)

''اور جب (اخیر) فیصلہ ہو چکے گا (اور لوگ شیطان کو الزام دیں گے) تو شیطان کہے گا کہ خدا نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا (سو اس نے پورا کیا) اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا مگر میں نے تمہارے ساتھ وعدہ خلافی کی اور تم پر میری کچھ زبردستی تو تھی نہیں۔ بات تو اتنی ہی تھی کہ میں نے تم کو (اپنی طرف) بلایا اور تم نے میرا کہنا مان لیا تو اب مجھے الزام نہ دو بلکہ اپنے آپ کو الزام دو۔''

اس آیت کریمہ میں شیطان کے حکم اور وعدے کا ذکر ہے، نیز فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِيْنًا، يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ اِلَّا غُرُوْرًا، اُولٰئِكَ مَاْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًاo ﴾ (النساء:٤/١١٩-١٢١)

''اور جو شخص خدا کے سوا شیطان کو دوست بنائے (اور اس کی پیروی کرے) تو وہ صریح گھاٹے میں آ گیا (شیطان) ان کو وعدے دیتا ہے اور ان کو اُمیدیں دلاتا ہے اور شیطان ان سے جو (کچھ بھی) وعدہ کرتا ہے نرا دھوکا ہی ہوتا ہے۔ یہ ہیں جن کا (آخری) ٹھکانا دوزخ ہے اور وہاں سے کہیں بھاگنے نہیں پائیں گے۔''

﴿ اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ، وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً وَفَضْلاً، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ o ﴾ (البقرہ:٢/٢٦٨)

''شیطان تم کو تنگ دستی کا وعدہ دیتا ہے اور بے حیائی کا حکم کرتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے (قصوروں کی) معافی اور برکت کا تم سے وعدہ فرماتا ہے اور (بڑی) گنجائش والا (اور سب کے حال سے) واقف ہے۔''

اس آیت میں بھی اس کے حکم اور وعدے کا ذکر ہے۔ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب قبطی کو قتل کر دیا تو کہا:

﴿ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُضِلٌّ مُبِيْنٌ o ﴾ (القصص:٢٨/١٥)

''یعنی یہ تو (مجھ سے) ایک شیطانی حرکت (سرزد) ہوئی، کچھ شک نہیں کہ شیطان (آدمی کا) دشمن (اور اس کو) کھلم کھلا گمراہ کرنے والا ہے۔''

حضرت ابوبکرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے علاوہ کئی ایک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دستور تھا کہ جو مسائل اپنے اجتہاد سے بیان کرتے ان کے بارے میں فرمایا کرتے کہ یہ جواب جو میں نے دیے ہیں اگر درست ہوں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور غلط ہوں تو میری اور شیطان کی طرف سے ہیں۔

پس ان حضرات نے ان اعتقادات وغیرہ کو جو خلاف واقع انسان کے جی میں ڈالے

جاتے ہیں، شیطان کی طرف منسوب کیا ہے۔ اگر چہ یہ شخص گناہ گار نہیں ہوتا اس لیے کہ اس آدمی نے اپنی پوری طاقت صرف کی ہے۔ جیسے وہ شخص گنہگار نہیں ہوتا جس کو شیطان کی طرف سے نماز میں وسوسہ آئے، اور نہ ان خیالات سے گنہگار ہوتا ہے جو انسان اپنے دل میں باتیں کرتا ہے۔

بھول چوک پر مؤاخذہ نہ ہونے کی دلیل:

اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں اہل ایمان کا قول نقل فرمایا کہ انہوں نے کہا:

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ﴾ (البقرة:٢/٢٨٦)

''اے ہمارے رب! ہم سے مواخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا سرزد ہو جائے۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

(قَدْ فَعَلْتُ) [1] ''یعنی میں نے تمہاری دعا قبول کر لی۔''

درست بات یا درست کام کا بھول جانا اور غلطی کرنا دونوں شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاِذَا رَأَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْ اٰيَاتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (انعام:٦/٦٨)

''جب ایسے لوگوں کو کہیں تم دیکھو جو ہماری آیتوں کا مشغلہ بنا رہے ہوں تو ان (کے پاس) سے ٹل جاؤ یہاں تک کہ ہماری آیتوں کے سوا (دوسری) باتوں میں لگ جائیں اور اگر شیطان تم کو (ہماری یہ نصیحت کسی وقت) بھلا دے تو یاد آنے کے بعد (ایسے) ظالم لوگوں کے ساتھ ہرگز نہ بیٹھنا۔''

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تجاوز الله عن حديث النفس، رقم:١٩٩-٢٠٠- مسنداحمد(١/٣٣٢) رقم:٣٠٧١

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ نَامَ عَنْ صَلٰوۃٍ اَوْ نَسِیَھَا فَلْیُصَلِّھَا اِذَا ذَکَرَھَا)) ❶

''جو شخص سو یا رہے اور نماز فوت ہو جائے یا نماز پڑھنی بھول جائے تو جب یاد آئے فوراً پڑھ لے۔''

جب آپ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم غزوہ خیبر میں سوئے رہ گئے حتی کہ نماز کا وقت فوت ہوگیا تو (بیدار ہونے کے بعد) آپؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا:

((اِرْتَحِلُوْا فَاِنَّ ھٰذَا مَکَانٌ حَضَرَنَا فِیْهِ شَیْطَانٌ)) ❷

''یہاں سے کوچ کرو، کیونکہ یہ ایسی جگہ ہے کہ یہاں شیطان ہمارے ساتھ موجود ہے۔''

ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:

((اِنَّ الشَّیْطَانَ اَتٰی بِلَالًا فَجَعَلَ یُھَدِئُه، کَمَا یُھَدَّئُ الصَّبِیُّ حَتّٰی نَامَ)) ❸

''شیطان بلال رضی اللہ عنہ کے پاس آ کر اس کو تھپکی لگانے لگا جیسے بچے کو تھپکی لگا کر (سلاتے) ہیں۔ یہاں تک کہ بلال رضی اللہ عنہ سو یا رہا۔''

واقعہ یوں ہوا کہ آپؐ نے بلال رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا تھا کہ فجر کے وقت سب کو جگا دینا (لیکن) بلال رضی اللہ عنہ بھی دوسروں کی طرح سو گئے اور کسی کو بھی خبر نہ ہوئی، یہاں تک کہ دھوپ نکلی اور سب سے پہلے آپ ہی بیدار ہوئے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب من نسی صلاۃ فلیصل اذا ذکرھا، رقم: ٥٩٧۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب قضاء الصلاۃ الفائتۃ، رقم: ٣١٤

❷ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب قضاء الصلاۃ الفائتۃ، رقم: ٣١٠۔ مسند احمد (٤٢٩/٢) رقم: ٩٥٣٠۔ مؤطا امام مالک، کتاب وقوت الصلاۃ، باب النوم عن الصلاۃ، رقم: ٢٦

❸ مؤطا امام مالک، کتاب وقوت الصلاۃ، باب النوم عن الصلاۃ، رقم: ٢٦

علیٰ ہذا القیاس نیند اور اُونگھ جو مامور بہ سے غافل کر دے وہ بھی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے، اگرچہ اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ ذکر کی مجلس میں اُونگھ آنا شیطان کی طرف سے ہے۔ اسی طرح نیند میں احتلام ہونا بھی شیطان کی طرف سے ہے۔ حالانکہ (شریعت میں ثابت ہے کہ) سونے والے پر مواخذہ نہیں۔

خواب کی تین قسمیں:

صحیحین میں نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ خواب کی تین قسمیں ہیں:

①...... اللہ کی طرف سے دکھلاوا ②...... شیطان کی طرف سے دکھلاوا ③...... اور ایک آدمی بیداری میں جو باتیں کرتا ہے بعض اوقات وہی نیند میں بھی دیکھتا ہے۔ ❶

بعض نے کہا یہ تقسیم ابن سیرین (تابعی معبر) کے کلام سے ہے۔ لیکن خواب کی مذکورہ تقسیم میں سے پہلی دو قسمیں تو بلاشبہ نبی ﷺ سے ثابت ہیں۔ خواب کی پہلی دونوں اقسام عام طور پر دلی وسوسہ اور شیطانی وسوسہ دونوں سے ممکن ہوتی ہیں اور دونوں پر مواخذہ نہیں۔

کیوں کہ حدیث میں ہے کہ سوئے ہوئے سے حساب کا قلم اُٹھا لیا گیا ہے۔ شیطان کا وسوسہ دل کو ڈھانپ لیتا ہے، جیسے خیال کا پردہ دل پر آ جاتا ہے۔ پھر جو ایمان اس کے پاس ہو وہ شیطان اسے بھلا دیتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق سے اندھا ہو کر باطل میں پڑ جاتا ہے۔

اگر انسان اس شیطانی خیال میں پھنسنے سے پہلے متقین میں سے ہو تو پھر اس کو حق سوجھ جاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَاهُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴾ (اعراف:۷/۲۰۱)

"جو لوگ پرہیزگار ہیں جب کبھی شیطان کی طرف کا کوئی خیال ان کو چھو بھی جاتا ہے تو (فوراً) متنبہ ہو جاتے ہیں اور وہ اُسی دم (راہ ثواب) دیکھنے لگتے ہیں۔"

---

❶ صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب القید فی المنام، رقم:۷۰۱۷۔ صحیح مسلم، کتاب الرؤیا، باب فی کون الرؤیا من الله وانها جزء من النبوة، رقم:٦

کیوں کہ شیطان کی عادت ہے کہ اپنی طرف سے ان کو ایسے خیال میں لگا دیتا ہے جو ان کے دل کو ڈھانپ لے، کبھی یہ خیال نہایت لطیف اور باریک ہوتا ہے اور کبھی کثیف اور گندا بھی۔ بہر حال وہ دل پر پردہ سا پڑ جاتا ہے جو حق کے دیکھنے سے مانع ہوتا ہے، نبی ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَذْنَبَ نُكِتَتْ فِي قَلْبِهِ نُكْتَةٌ سَوْدَآءٌ ۔ فَإِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُهُ. وَإِنْ زَادَ زِيدَ فِيهَا حَتّٰى تَعْلُوَ قَلْبَهُ ۔ فَذَالِكَ الرَّانُ الَّذِي قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: ﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴾)) (مطففين:٨٣/١٤) [1]

''جس وقت بندہ گناہ کرتا ہے اس کے دل پر ایک سیاہ داغ لگ جاتا ہے پھر اگر توبہ کرے اور گناہ سے باز آ جائے اور استغفار کرے تو اس کا دل صیقل کیا جاتا ہے (صاف اور روشن ہو جاتا ہے) اور اگر (باز نہ آئے اور) زیادہ گناہ کرتا جائے تو وہ داغ بھی بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ (تمام) دل پر چھا جاتا ہے۔ تو یہی ہے وہ زنگ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے (سورہ مطففین) میں فرمایا ''نہیں نہیں'' بلکہ (بات یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر ان (ہی) کے اعمالِ (بد) سے زنگ بیٹھ گئے ہیں۔''

شیطانی خیال اور گناہوں کا زنگ:

لیکن شیطانی خیال الگ ہوتا ہے اور گناہوں کی وجہ سے زنگ دوسری چیز۔ گناہوں کی سزا دراصل زنگ کی صورت میں ہوتی ہے۔ اور ''غین'' بھی زنگ کی ہی ایک قسم ہے، لیکن اس سے قدرے لطیف اور باریک ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] سنن ترمذی، كتاب التفسير، باب ومن سورة ويل للمطففين، رقم:٣٣٣٤ ـ سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب ذكر الذنوب، رقم:٤٢٤٤ ـ مستدرك حاكم (٢/٥١٧) كتاب التفسير، باب تفسير سورة المطففين

((اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ وَاِنِّىْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِى الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً))❶

''یعنی میرے دل پر ہلکا سا پردہ آ جاتا ہے اور میں ایک دن میں ستر مرتبہ بھی بخشش مانگتا ہوں۔''

شیطان تو آدمی کے دل میں برائی ڈالتا ہے جب کہ فرشتہ نیکی ڈالتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهٖ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْمَلَائِكَةِ وَقَرِيْنُهٗ مِنَ الْجِنِّ۔ قَالُوْا وَاِيَّاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ وَاِيَّایَ اِلَّا اَنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِىْ عَلَيْهِ فَاَسْلَمَ))

''تم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک قرین (ہم نشین) فرشتوں میں سے مقرر کیا گیا ہے اور ایک قرین جنوں میں سے۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ آپ کے ساتھ بھی ہر دو قرین مقرر کیے گئے ہیں۔ فرمایا: میں بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، ہاں اتنی بات ہے کہ اُس (قرین جنی) پر اللہ تعالیٰ نے میری امداد کی ہے تو وہ مسلمان ہو گیا ہے۔''

ایک روایت میں:

((فَلَا يَاْمُرُنِىْ اِلَّا بِخَيْرٍ))❷

''اب وہ سوائے خیر اور نیکی کے اور کسی کام کا مجھے مشورہ نہیں دیتا۔''

حدیث میں جو اسلم کا لفظ آیا ہے اس کا معنی ہے کہ مطیع اور فرمانبردار ہو گیا۔

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ (تابعی) اس کو فَاَسْلَمُ بضم میم روایت کرتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں ''میں اس کے شر سے سلامت رہتا ہوں'' کیونکہ وہ کہا کرتے تھے کہ شیطان اسلام نہیں لاتا۔

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب استحباب الاستغفار والاستکثار منه، رقم: ٤١

❷ صحیح مسلم، کتاب المنافقین، باب تحریش الشیطان وبعثه سرایا......، رقم: ٦٩۔ مسند احمد (١/٣٨٥) رقم: ٣٦٤٨

لیکن دوسری روایت میں جو آنحضرت کا قول مذکور ہے:

((فَلَا یَأْمُرُنِی إِلَّا بِخَیْرٍ))

یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اب وہ جن ایسا نہیں رہا کہ آپ کو برائی کا حکم کرے، اس کے اسلام سے یہی مراد ہے۔ یہ فرماں برداری اس کی بیچارگی اور ذلت کا اشارہ کرتی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آیا۔

اس کی مثال اس طرح سمجھنی چاہیے: جیسے کوئی انسان دشمن پر دباؤ ڈال کر اسے قید کر لیتا ہے تو وہ مقہور دشمن جانتا ہے کہ مجھ پر غالب اور مجھے قید کرنے والا شخص میرے غلط مشورے کو سمجھ لے گا اور اسے قبول کرنے کے بجائے اُلٹا اس پر مجھے سزا دے گا۔ چناں چہ مجبوراً یہ قیدی اپنے مالک کو خیراندیشی اور دیانتداری کا ہی مشورہ دے گا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِلَّا أَنَّ اللّٰهَ أَعَانَنِی عَلَیْهِ فَلَا یَأْمُرُنِی إِلَّا بِخَیْرٍ)) [1]

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

(إِنَّ لِلْمَلِكِ لَمَّةً وَإِنَّ لِلشَّیْطَانِ لَمَّةً فَلَمَّةُ الْمَلِكِ إِیْعَادٌ بِالْخَیْرِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْحَقِّ وَلَمَّةُ الشَّیْطَانِ إِیْعَادٌ بِالشَّرِّ وَتَكْذِیْبٌ بِالْحَقِّ) [2]

''فرشتے کو بھی انسان کے ساتھ ایک قسم کا لگاؤ ہے اور شیطان کو بھی۔ فرشتے کا لگاؤ تو یہ ہے کہ نیکی کا وعدہ کرتا ہے اور سچ بات کی تصدیق کرتا یقین دلاتا ہے۔ جب کہ شیطان کا لگاؤ یہ ہے کہ برائی کا وعدہ دیتا ہے اور حق کو جھٹلاتا ہے۔''

تخویف شیطانی:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ إِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطَانُ یُخَوِّفُ أَوْلِیَاءَهُ ﴾ (سورۂ آل عمران:۳/۱۷۵)

---

[1] صحیح مسلم، کتاب المنافقین، باب تحریش الشیطان وبعثه سرایا......، رقم:۶۹۔ مسنداحمد(۱/۳۸۵)رقم:۳۶۴۸

[2] سنن ترمذی، کتاب التفسیر، باب من سورة البقرة، رقم:۲۹۸۸

* ''سوائے اس کے اور کوئی بات نہیں کہ یہ شیطان ہے جو تمہیں اپنے یارانِ بد سے ڈراتا ہے۔''

مراد یہ کہ رعب کے وسوسے تمہارے دلوں میں ڈال کر اپنے یارانِ شر سے تمہیں خوف دلاتا ہے، جیسے انسانوں میں شیاطین کی عادت ہوتی ہے کہ افواہیں اُڑا کر اور مقابلہ پر اُبھار کر مدد کے وقت ساتھ چھوڑ دیتا اور ذلیل وخوار کرتا ہے۔

تثبیت ربانی:

اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

﴿ وَاِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ ﴾ (انفال:۸/۱۲)

''(اے پیغمبر ﷺ)! یہ وہ وقت تھا کہ تمہارا پروردگار فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تو تم ایمان والوں کو جمائے رکھو، میں عنقریب کافروں کے دلوں میں دہشت ڈال دوں گا۔''

﴿ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ (ابراهيم:۱٤/۲۷)

''جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کو پکی بات (یعنی کلمہ توحید) کی برکت سے اللہ دنیا میں بھی ثابت (قدم) رکھتا ہے اور آخرت میں بھی۔''

﴿ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ﴾

(بنی اسرائیل:۱۷/۷٤)

''(اے پیغمبر ﷺ)! اگر ہم تمہیں ثابت (اور برقرار) نہ رکھتے تو بہت (ممکن اور) قریب تھا کہ تم ان کی طرف کچھ تھوڑا سا جھک پڑتے۔''

تثبیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو ایسا استوار اور برقرار کر دیا جائے کہ تذبذب اور شبہ کا شکار نہ ہو۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ حق کی تصدیق اور خیر کا وعدہ اس کے دل میں بایں طور

القا کر دیا جاتا ہے کہ اس کا اعتقاد پختہ ہو جائے۔

چناں چہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

(لُمَّةُ الْمَلِكِ وَعْدٌ بِالْخَيْرِ وَتَصْدِيقٌ بِالْحَقِّ) ❶

جب انسان کا دل یہ معلوم کر لیتا ہے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے حق ہے تو اس کی تصدیق کرتا ہے (اس پر یقین کر لیتا ہے)۔ اور جب جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تصدیق کی وجہ سے (کامیابی کا) وعدہ کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اس کو وثوق ہو جاتا ہے۔ لہٰذا صحیح راہ پر قائم اور برقرار ہو جاتا ہے۔

تثبیت کی دو قسمیں:

زبانی ثابت قدمی اختیار کرنا: جیسے ایک انسان دوسرے کو کسی معاملے میں متردّد اور مضطرب ہوتا دیکھتا ہے تو باتوں کے ساتھ اسے مضبوط اور استوار کرتا ہے، بایں طور کہ اس کو یقین دلائے کہ تو صحیح راہ پر ہے اور اس سے ایسی تسکین دہ باتیں کرے جن سے اس کو معلوم ہو جائے کہ وہ کامیاب ہوگا۔ اور ان باتوں کو سن کر وہ قائم و برقرار ہو جاتا ہے۔

عملاً ثابت قدمی اختیار کرنا: کہ بے قراری اور اضطراب کے وقت اپنے دل کو برقرار رکھے، جیسے کوئی انسان کسی پھسلتے ہوئے انسان کو تھام لے تاکہ اس کا پاؤں مضبوط ہو کر جم جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

((مَنْ سَأَلَ الْقَضَاءَ وَاسْتَعَانَ عَلَيْهِ وُكِّلَ إِلَيْهِ ، وَمَنْ لَّمْ يَسْئَلِ الْقَضَاءَ وَلَمْ يَسْتَعِنْ عَلَيْهِ ، أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ مَلَكًا يُسَدِّدُهُ)) ❷

"جو شخص قاضی بننے کی درخواست کرے اور اس پر (دوسروں کی سفارش وغیرہ سے)

---

❶ سنن ترمذی، کتاب التفسیر، باب من سورة البقرة، رقم: ۲۹۸۸

❷ سنن ابو داؤد، کتاب الاقضية، باب فی طلب القضاء، رقم: ۳۵۷۸۔ سنن ترمذی، کتاب الاحکام، باب ماجاء عن رسول الله فی القاضی، رقم: ۱۳۲۳

امداد چاہے، تو وہ اپنے نفس کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اور جو منصب قضاء (حاصل کرنے) کی درخواست نہ کرے اور نہ اس پر کسی سے امداد چاہے تو اس پر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ نازل کرتا ہے جو اس کو راستی پر رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔"

یہ فرشتہ اس کے دل میں تصدیق حق اور وعدہ بالخیر کا القاء کر کے اسے راست باز بنا دیتا ہے۔

لفظ صلوٰۃ کا مفہوم:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ هُوَ الَّذِىْ يُصَلِّىْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ (الاحزاب:۳۳/۴۳)

"وہی ہے جو تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے (بھی) تا کہ (اس کی برکت سے) خدا تم کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان) کی روشنی میں لے جائے۔"

یہ آیت کریمہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ صلوٰۃ (یعنی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کا رحمت بھیجنا) مسلمان بندوں کے تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکلنے کا سبب ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایمان والوں کو ظلمات سے نکال کر روشنی کی طرف لانے کا ذکر کئی ایک آیات میں فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيَآءُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمَاتِ ﴾

(البقرۃ:۲/ ۲۵۷)

"اللہ ایمان والوں کا حامی و مددگار ہے، کہ ان کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان کی) روشنی میں لاتا ہے اور جو لوگ (دین حق سے) منکر ہیں ان کے حمایتی شیطان ہیں کہ ان کو (ایمان کی) روشنی سے نکال کر (کفر کی) تاریکیوں میں دھکیلتے ہیں۔"

(سورۂ حدید) میں فرمایا:

﴿ هُوَ الَّذِىْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾ (حدید:۵۷/ ۹)

”وہ (اللہ) ذات پاک ہے جو اپنے بندے (محمد ﷺ) پر کھلی کھلی نشانیاں نازل کرتا ہے تا کہ (ان کی وجہ سے) تم کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لائے۔“

مزید فرمایا:

﴿ كِتَابٌ اَنزَلْنَاهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ﴾ (ابراهيم:١٤/١)

”(اے پیغمبر) یہ کتاب ہے جس کو ہم نے تمہاری طرف اس لیے نازل کیا ہے تا کہ تم (اس کی بدولت) لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے اندھیروں سے نور کی طرف نکال لاؤ۔“

ایک حدیث میں ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلٰى مُعَلِّمِ النَّاسَ الْخَيْرَ)) [1]

”اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے لوگوں کو نیکی کی تعلیم دینے والے پر رحمت بھیجتے ہیں۔“

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ شخص نیکی کی تعلیم دے کر لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر نور میں لے جاتا ہے۔ ہر عمل کی جزا جنس عمل سے ہوتی ہے۔ لہٰذا اس عمل کے صلہ میں اللہ تعالیٰ اور ملائکہ بھی اس پر رحمت بھیجتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے بڑھ کر اس صلوٰۃ کی تاثیر کے مستحق ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب میں فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ﴾ (الاحزاب:٣٣/٥٦)

”اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔“

فرشتوں کی طرف منسوب لفظ صلوٰۃ کے معنی:

صلوٰۃ جب فرشتوں کی طرف مضاف ہو تو اس کے معنی دعا ہوتے ہیں، خواہ جملہ خبریہ متضمنِ دعا ہو خواہ دُعا کے صیغہ میں سے ہو۔ چناں چہ نبی ﷺ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

---

[1] سنن ترمذی، کتاب العلم، باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة، رقم:٢٦٨٥

((وَالْمَلٰئِكَةُ تُصَلِّيْ عَلٰى اَحَدِكُمْ مَا دَامَ فِيْ مُصَلَّاهُ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ مَا لَمْ يُحْدِثْ)) ❶

"جب تک تم میں سے کوئی اپنی نماز کی جگہ (یعنی مسجد میں) بیٹھا رہے تو فرشتے اس پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں (کہتے ہیں) اے اللہ! اس کو بخش، اس پر رحم کر۔ جب تک اس کا وضو نہ ٹوٹے (تب تک یہی دُعا کرتے رہتے ہیں)۔"

اس حدیث میں آپ نے بیان فرمادیا کہ فرشتوں کی صلوٰۃ سے مراد یہ ہے کہ وہ ان الفاظ میں دعائیں مانگتے ہیں:

((اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ))

اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب صلوٰۃ کے معنی:

جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو۔

ایک اثر میں منقول ہے کہ رب تعالیٰ شانہ صلوٰۃ بھیجتا ہے، فرماتا ہے:

((سَبَقَتْ اَوْ غَلَبَتْ رَحْمَتِيْ غَضَبِيْ)) ❷

"میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔ (یا یوں فرمایا) میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔"

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ کلام (لفظاً) خبر اور (معنیً) انشاء ہے۔ ان الفاظ کا مضمون یہ ہے کہ رحمت (الٰہی) غضب پر سبقت لے جاتی ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صلوٰۃ کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے غیر سے مطالبہ کرتا ہو کہ وہ ایسا کرے جیسے فرشتے اور ان کے علاوہ دوسری مخلوقات اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتی ہیں۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلوة، رقم: ٦٥٩۔ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب فضل صلاة المکتوبة فی جماعة وانتظار الصلاة، رقم:٢٧٣

❷ صحیح بخاری، کتاب التوحید، رقم:(٢١٦/٨) صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة الله، رقم:١٤

بلکہ اللہ تعالیٰ کی طلب سے مراد یہ ہے کہ وہ حکم کرتا ہے یا فرمان صادر کرتا ہے یا کسی بات کی قسم کھاتا ہے، مثلاً یوں کہہ دینا:

(لَأَفعلنَّ كَذَا)

''مجھے قسم ہے میں ضرور ایسا کروں گا۔''

اور (کُنْ) فرما دینا یعنی (جس امر کا وجود میں لانا منظور ہو اس کو کہہ دینا) ہو جا! تو وہ (امر فوراً) ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو (لَأَفْعَلَنَّ كَذَا) فرمایا تو اس میں اللہ تعالیٰ قسم کھا رہا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل تمام آیات اس قسم کی مثالیں ہیں:

﴿ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ ﴾ (ص:۳۸/۸۵)

''میں قسم کھاتا ہوں کہ جہنم کو تجھ سے اور تیری پیروی کرنے والوں سے بھر دوں گا۔''

﴿ وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴾

(الم سجدہ:۳۲/۱۳)

''لیکن میری طرف سے اس بات کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ جہنم کو جنوں اور آدمیوں سب سے ضرور ہی بھر دوں گا۔''

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ، وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِيْ ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا. ﴾ (نور:۲٤/۵۵)

''تم میں جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے رہے اُن سے خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کی خلافت ضرور عطا کرے گا جیسے ان لوگوں کو خلافت عطا کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں اور جس دین کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) اس کو ان کے لیے جما کر رہے گا اور موجودہ خوف وخطر کے بعد ان کو امن دے گا۔''

﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِىْ، اِنَّ اللّٰهَ قَوِىٌّ عَزِيْزٌ﴾(مجادلہ:۵۸/۲۱)

''خدا تو لکھ چکا ہے کہ ہم اور ہمارے پیغمبر ضرور ہی غالب آ کر رہیں گے، اللہ تعالیٰ ہی قوی اور غالب ہے۔''

مذکورہ بالا تمام آیات میں اللہ تعالیٰ کے ایک وعدے کا ذکر ہے جس کے ساتھ قسم بھی شامل ہے۔ لیکن سورہ مومن کی اس آیت میں محض وعدہ اور خبر ہے:

﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا.﴾(مومن:۴۰/۵۱)

''ہم دنیا کی زندگی میں ضرور اپنے پیغمبروں اور ایمان والوں کی مدد کرتے ہیں۔''

اس میں وعدہ بھی ہے اور خبر بھی، لیکن قسم اس میں مذکور نہیں۔ البتہ یہ موکد باللام ہے جس کا جواب قسم بننا ممکن ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مندرجہ ذیل آیتوں میں بھی صرف وعدہ ہے بلا قسم اور تاکید:

﴿وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا﴾ (فتح:۴۸/۲۰)

''اللہ تعالیٰ نے تم سے غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے جن پر تم قابو پاؤ گے۔''

﴿وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ﴾ (انفال:۸/۷)

''اللہ تعالیٰ کا وہ احسان یاد کرو جبکہ وہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک پر تم فتح پاؤ گے۔''

اس قسم کے وعدے بلا قسم اور تاکید کے متعدد آیات میں آتے ہیں۔

القاء فی القلب کی اقسام:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِىَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ (شوریٰ:۴۲/۵۱)

''کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کھلم کھلا کلام کرے، مگر ہاں (اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کی تین صورتیں ہیں): دل میں بات ڈال دینا، پردہ کے پیچھے سے کلام کرنا یا کوئی فرشتہ بھیج دینا جو اس کے حکم سے جو وہ چاہے دل میں ڈال دیتا ہے۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ بشر کی طرف اللہ تعالیٰ وحی اس طرح کرتا ہے کہ کبھی دل میں القاء کر دیتا ہے اور کبھی کوئی قاصد بھیج دیتا ہے جو رسول مکرم کو اللہ کی اجازت سے اس کے پسند کردہ امر کا القاء کرتا ہے۔

قاصد ملائکہ عظام ہیں۔ ملائکہ ملک کی جمع ہے۔ ملک کے معنی پیغام لے جانا، اس لیے کہ اس کلمہ (ملک) کی اصل مَلْاَکٌ ہے مَفْعَلٌ کے وزن پر، لیکن کثرتِ استعمال سے اس میں تخفیف کی گئی۔ ہمزہ کی حرکت اس کے ماقبل لام ساکن کی طرف منتقل کی گئی اور ہمزہ کو حذف کر دیا گیا۔ مَلْأَکٌ مَأْلُکٌ سے ماخوذ ہے اور اس مادہ کے معنی خواہ ہمزہ لام پر مقدم ہو یا لام ہمزہ پر (مقدم ہو) رسالت (پیغام لے جانے) کے ہی ہیں۔ اسی طرح اَلُوْکَۃ بتقدیم ہمزہ برلام (کے معنی بھی پیغام برداری کے ہیں) شاعر نے کہا ؎

اَبْلِغِ النُّعْمَانَ عَنِّیْ مَأْلُکًا
اِنَّہٗ قَدْ طَالَ حَبْسِیْ وَانْتِظَارِیْ

''نعمان کو میری طرف سے پیغام پہنچا دے کہ میری مدتِ حبس اور انتظار بہت طویل ہوگئی ہے۔''

اس میں ہمزہ لام پر مقدم ہے (اور اس کے معنی پیغام کے ہیں) لیکن مَلْکَ جو مَلَکُ (کی اصل ہے اس) میں لام ہمزہ پر مقدم ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ کیوں کہ اشتقاقِ اکبر میں اس کی نظیر لاکَ یَلُوْکُ کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب (انسان) کلام کرتا (اور گھوڑا) لگام کو (منہ میں) چباتا ہو۔ ہمزہ واؤ سے زیادہ قوی ہے۔ اس کے بعد اس کی نظیر اشتقاقِ اوسط اَکَلَ یَاْکُلُ ہے، اس لیے کہ کھانے والا بھی جو غذا پیٹ میں داخل کرتا ہے اس کو (منہ میں) چباتا ہے۔

بعینہٖ کلام اور علم بھی ایسی چیز ہے کہ انسان اسے اپنے اندر داخل کر لیتا ہے اور اس سے غذا پاتا ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

(اِنَّ کُلَّ اَدَبٍ یُحِبُّ اَنْ تُؤْتٰی مَاْدُبَتُہٗ وَاِنَّ مَاْدُبَۃَ اللّٰہِ الْقُرْاٰنُ)

''ہر میزبان پسند کرتا ہے کہ اس کی ضیافت قبول کی جائے اور اللہ تعالیٰ کی ضیافت قرآن ہے۔''

ادب کے معنی ہیں مہمانی کرنے والا اور مَاْدُبَة (دال پر ضمہ اور فتح دونوں جائز ہیں) کے معنی ضیافت ہیں، جس سے وہ طعام مراد ہوتا ہے جو مہمان کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

یہ اثر بیان کر کے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ثابت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نازل کردہ کلام سے اپنے بندوں کی ضیافت کی ہے۔ یہ کلام اللہ بندوں کے دلوں کی (روحانی) غذا اور قوت ہے، انسانی دل اس سے بہت نفع حاصل کرتے ہیں۔ کیوں کہ جس قدر بدن غذا کا محتاج ہے اس سے کہیں بڑھ کر دل روحانی غذا کا محتاج ہے۔

امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (رَبَّانِی) وہ لوگ ہیں جو حکیمانہ اقوال سے لوگوں کو غذا دیتے اور ان کی پرورش کرتے ہیں۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنِّیْ اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّیْ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِیْ))[1]

''میں اپنے رب کے ہاں رات گزارتا ہوں وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔''

ان دونوں باتوں سے معلوم ہوا کہ کلامِ الٰہی روحانی غذا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن سینوں کی بیماریوں کی شفا ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ لوگ دل و بدن کی تندرستی کے لیے غذا کے محتاج ہوتے ہیں۔ لہٰذا کلامِ الٰہی شفا سے بڑھ کر غذا کا بھی فائدہ دیتا ہے۔

صحیحین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

((مَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰی وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَصَابَ اَرْضًا فَكَانَتْ مِنْهَا طَآئِفَةٌ اَمْسَكَتِ الْمَاءَ فَاَنْبَتَتِ الْكَلَا وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ وَكَانَتْ

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب التنکیل لمن اکثر الوصال، رقم:۱۹۶۵۔ صحیح مسلم، کتاب الصوم، باب النهی عن الوصال، رقم:۵۸

مِنْهَا طَآئِفَةٌ اَمْسَكَتِ الْمَآءَ فَشَرِبَ النَّاسُ وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا وَكَانَتْ مِنْهَا طَآئِفَةٌ اِنَّمَا هِیَ قِیْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَآءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَأً ۔ فَذَالِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِی دِیْنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهٗ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰی وَالْعِلْمِ وَمَثَلُ مَنْ لَّمْ یَرْفَعْ بِذَالِكَ رَأْسًا وَّلَمْ یَقْبَلْ هُدَی اللّٰهِ الَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ۔)) ❶

’’جو ہدایت اور علم دے کر اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک زمین پر مینہ برسا تو کچھ حصہ تو اس زمین کا ایسا تھا کہ اس نے پانی کو جذب کر لیا اور اس میں کثرت سے روئیدگی اور گھاس پیدا ہوئی۔ کچھ حصہ اس زمین کا ایسا تھا کہ اس میں سبزہ اُگانے کی صلاحیت تو نہ تھی لیکن اس نے پانی روک رکھا جو انسانوں نے خود پیا اور جانوروں اور کھیتوں کو پلایا۔ کچھ حصہ اس زمین کا ایسا تھا کہ وہ صرف چٹیل میدان تھا نہ وہاں پانی رکا اور نہ گھاس اور سبزہ پیدا ہوا۔ یہ ظاہری مثال لوگوں کی حقیقت حال ہے۔ بعض وہ ہیں جنھوں نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی اور جو ہدایت اور علم اللہ تعالیٰ کے ہاں سے مجھے عطا ہوا اس سے بہرہ مند ہوئے۔ زمین کے پہلے دو ٹکڑے ان لوگوں کی مثال ہیں، لیکن بعض لوگوں نے اس (علم و ہدایت کی طرف) توجہ ہی نہ کی اور جو ہدایت دے کر مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا اسے قبول نہ کیا (زمین کا تیسرا حصہ اس دوسری مثال جیسی ہے)۔‘‘

اس حدیث میں آپ نے بتلا دیا کہ جو علم و ہدایت آپ لائے ہیں وہ دلوں کے حق میں ایسا ہے جیسے زمین کے حق میں پانی کہ کبھی تو وہ اسے جذب کر کے روئیدگی اُگاتی ہے اور کبھی سمیٹ کر محفوظ رکھتی ہے اور کبھی نہ سبزہ اُگاتی ہے نہ پانی کو محفوظ رکھتی ہے۔

زمین پانی کو جذب کر کے اس سے غذا حاصل کرتی ہے تب اس قابل ہوتی ہے کہ اس سے بہتری اور بھلائی کا عمل یعنی عمدہ پیداوار حاصل کی جائے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب العلم، باب فضل من علم و علم، رقم:۷۹۔ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب بیان مثل ما بعث النبی من الهدی والعلم، رقم:۱۵

اس علم و ہدایت کو اللہ تعالیٰ نے روح بھی کہا ہے جس کی بدولت دل زندہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ وَكَذَالِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِنْ اَمْرِنَا، مَا كُنْتَ تَدْرِى مَا الْكِتَابُ وَلاَ الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَهْدِىْ بِهٖ مَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا، وَاِنَّكَ لَتَهْدِىْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (شوریٰ:۴۲/۵۲)

”(اے پیغمبرؐ) ہم نے اپنے حکم سے رُوح (یعنی یہ تعلیم حکمت) تمہاری طرف وحی کے ذریعے سے بھیجی ہے۔ تمہیں (پہلے) یہ معلوم نہ تھا کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ ہی ایمان (کی حقیقت سمجھتے تھے) مگر ہم نے قرآن کو ایک نور بنایا ہے کہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں اس کے ذریعے سے (دین) کا راستہ دکھا دیتے ہیں تو تم بھی بلاشبہ لوگوں کو سیدھا راستہ بتاتے ہو۔“

جب یہ ثابت ہو چکا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی طرف القاء کرتا ہے کبھی فرشتے کے واسطے سے اور کبھی بلا واسطہ، بلا واسطہ کی یہ صورت مطلقاً سب مومنوں کے لیے عام ہے، صرف انبیاء کے ساتھ مختص نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ﴾ (قصص:۲۸/۷)

”ہم نے موسیٰ کی والدہ کی طرف وحی کی (الہام اور القاء کیا) کہ موسیٰ کو دودھ پلاؤ۔“

حالانکہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی والدہ نبی نہ تھیں، نیز فرمایا:

﴿ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِىْ وَبِرَسُوْلِىْ، قَالُوْا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴾ (مائدہ:۵/۱۱۱)

”جب ہم نے حوارین (حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ماننے والوں) کی طرف وحی کی کہ ہم پر اور ہمارے رسول پر ایمان لاؤ، انہوں نے کہا ہم نے مان لیا اور (اے اللہ) تو اس امر پر گواہ رہ کہ ہم تابع مطیع فرمان ہیں۔“

یہاں صورت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حیوانات کی طرف بھی وحی کرتا ہے۔ چنانچہ سورۃ

نمل میں فرمایا:

﴿ وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ ﴾ (النحل:١٦/٦٨)

''تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔''

چناں چہ انسان کی طرف تو اس وحی کا ثبوت بطریق اولیٰ ہوگا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَاءٍ اَمْرَھَا ﴾ (حم سجدہ:٤١/١٢)

''ہر آسمان میں اس نے انتظامِ تدبیر کی وحی بھیجی۔''

اور فرمایا:

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا .فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا ﴾ (الشمس:٩١/٧۔٨)

''قسم ہے جان کی اور اس ذات کی جس نے اس کو درست بنایا۔پھر اس کے دل میں اس کی بدکاری اور پرہیز گاری کا الہام بھی کر دیا۔''

یہ سمجھ لینا چاہیے کہ بدکاری اور پرہیز گاری دونوں کا القا تو اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے۔البتہ اوّل الذکر یعنی الہامِ فجور کا ظہور بواسطہ شیطان ہوتا ہے جسے القاء وسواس بھی کہتے ہیں اور مؤخر الذکر یعنی الہامِ تقویٰ فرشتے کے واسطہ سے ہوتا ہے اور یہ الہامِ (القاء) وحی کہلاتا ہے۔ شیطان تو فجور (اور بدکاری) کا حکم کرتا ہے، جب کہ فرشتہ نیکی اور تقویٰ کا حکم کرتا ہے۔چناں چہ حکم دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ کوئی خبر بھی ملائی جائے۔

الہام اور وسوسہ میں امتیاز:

اب عرفِ عام یہ قرار پایا ہے کہ لفظ الہام جب مطلق بلاقید بولا جائے تو اس سے وسوسہ مراد نہیں ہوتا۔آیت کریمہ (سورہ والشمس کی) اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ وحی الہام اور وسوسہ میں فرق ہے۔یعنی جس کام کا حکم دیا گیا، اگر خوفِ خدا اور تقویٰ سے اس کا تعلق ہو تو وہ وحی والہام ہے۔اور اگر فجور و بدکاری کی قسم سے ہو تو شیطانی وسوسہ ہے۔

چناں چہ الہام محمود اور وسوسہ مذمومہ میں فرق کرنے کا ذریعہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے۔جس چیز کا دل میں القا ہو اگر کتاب اور سنت اس امر کی راہنمائی کرتے ہیں تو یہ

ازقسم تقویٰ ہے، اور وہ الہام محمود ہوگا۔ بصورت دیگر کتاب وسنت یہ بتائیں کہ وہ ازقسم فجور ہے تو وسواس مذموم ہوگا۔ فرق کرنے کا یہ طریقہ ہر جگہ جاری ہوسکتا ہے کہیں بھی اس سے اختلاف نہیں ہوتا۔

وسوسہ نفس اور وسوسہ شیطان میں امتیاز:

ابو حازم رحمہ اللہ نے وسوسہ نفس اور وسوسہ شیطان میں اس طرح فرق کیا ہے کہ اگر انسان کا نفس اس کو اپنے لیے پسند نہ کرے تو سمجھ لے کہ شیطان کی طرف سے وسوسہ ڈالا گیا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے اور اگر اس کا نفس اس کو اپنے لیے پسند کرے تو وہ نفس کا اپنا وسواس ہے نفس کو اس سے کے۔

نظر اور استدلال کے بعد جو علم حاصل ہوتا ہے، اس کا بیان:

اس علم کے بارے میں جو نظر اور استدلال کے بعد قلب میں حاصل ہوتا ہے، متکلمین اور مناظرین نے تین اقوال ذکر کیے ہیں: چناں چہ امام ابو حامد غزالیؒ نے اپنی (کتاب) مستصفیٰ وغیرہ میں جہمیہ، قدریہ اور فلاسفہ کے اقوال ذکر کیے ہیں۔ البتہ اکثر اہل کلام صرف دو قول ذکر کرتے ہیں: جہمیہ کا قول اور قدریہ کا قول۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں میں انھی لوگوں کے اقوال ذکر کرتے ہیں جن کو وہ جانتے پہچانتے ہیں کہ انہوں نے اس مسئلہ میں کلام کیا ہے، وہ ان کے سوا کسی کو نہیں جانتے۔ دراصل یہ مسئلہ، مسئلہ قدر کے فروع میں سے ہے۔ کیوں کہ جو چیز نفس میں حاصل ہوتی ہے وہ اسی (نفس ہی) میں پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا اس (علم نظری اور استدلالی) میں بھی اقوال اسی طرح ہوں گے جس طرح اس جیسے (باقی حوادث) میں ہیں۔

جہم اور اس کے ہم خیال ابوالحسن اشعری اور بہت سے متاخرین جو صفاتِ الٰہی کو ثابت مانتے ہیں، اس بات میں اہل سنت ہی کی طرح عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور بندوں کے افعال کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔ لیکن وہ (جہم اور اس کے موافقین) سبب اور قدرت موثرہ کو ثابت نہیں مانتے اور نہ وہ فعل رب تعالیٰ کی حکمت کے قائل ہیں۔

چناں چہ ان لوگوں نے قویٰ اور طبائع جیسے امور خارجی اور افعال کے اسباب وحکم کا انکار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی شے کا سبب نہیں مانتے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ موجودات کا ظہور اللہ تعالیٰ کی خلق اور قدرت سے حاصل ہے، اسباب کو ان میں دخل نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ کی قدرت کی طرف منسوب کرنے اور اس کے ماننے میں تو یہ سچے ہیں برخلاف قدریہ کے (کہ وہ اس کے منکر ہیں)۔ لیکن مکمل معرفت اسباب کو ثابت کرنے اور انہیں تسلیم کرنے میں ہے۔

لیکن معتزلہ وغیرہ قدریہ نے اس بات کی بنا اپنے ایک اصول پر رکھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ بندے کے فعل سے پیدا ہو وہ اسی کا فعل ہے، اس کی نسبت کسی دوسرے کی طرف نہیں کی جاسکتی۔ جیسے طعام (کھانے کے بعد) سیر ہو جانا۔ (پانی پینے سے) سیراب ہو جانا۔ (ہتھیار چلانے کے بعد) رُوح کا نکل جانا، وغیرہ وغیرہ۔ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ یہ علم بندہ کی نظر اور استدلال سے پیدا ہوا یا استدلال کے تذکر اور استحضار سے۔

فلاسفہ نے اس کی بنا اپنے ایک قاعدہ پر رکھی ہے کہ جو صورت (ذہن یا نفس میں) حادث ہوتی ہیں وہ عقل فعال کے فیض سے ہیں، بشرطیکہ مواد قابلہ میں استعداد موجود ہو۔ اس بنا پر انہوں نے کہا کہ یہ علم استدلالی مقدمتین کے استحضار کے وقت نفوس بشریہ میں عقل فعال کے فیض سے حاصل ہوتا ہے۔ بشرطِ استعدادِ نفس اور یہ قول بالکل غلط ہے۔ اس سے صحیح تر تو معتزلہ کا ہی قول ہے اور جہمیہ وغیرہ کا قول ان سب میں اقرب الی الصواب ہے لیکن اصل تحقیق کسی قول میں نہیں۔

حقیقۃ الامر یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کے ساتھ فرشتے اور شیطان مقرر کر رکھے ہیں جو ان کے قلوب میں خیر وشر کا القاء کرتے رہتے ہیں۔ پس سچا علم خیر سے حاصل ہوتا ہے اور عقائد باطلہ شر سے پیدا ہوتے ہیں۔ جیسا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

(لُمَّةُ الْمَلِكِ تَصْدِيقٌ بِالْحَقِّ وَلُمَّةُ الشَّيْطَانِ تَكْذِيبٌ بِالْحَقِّ)

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (قضا کی درخواست نہ کرنے والے) قاضی کے بارے میں فرمایا:

((اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ مَلَكًا يُّسَدِّدُهٗ)) ❶

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ فرشتے بشر کی طرف وحی (القاء) کرتے ہیں، اگر چہ بشر کو شعور نہیں ہوتا کہ یہ فرشتے کا القاء ہے۔ جس طرح کہ اُسے وسوسہ ڈالنے والے شیطان کا شعور نہیں ہوتا۔

لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ بشر سے کلام کرتا ہے، کبھی وحی (القاء) کے طور پر، کبھی فرشتہ کے ذریعہ سے کہ وہ (فرشتہ) بحکم الٰہی جو اللہ کی مرضی ہوتی ہے اس کا القاء کرتا ہے اور کبھی تیسرے طریق سے جو پردے کے پیچھے سے ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے کہا کہ وحی سے یہاں مراد وہ ہے جو خواب میں القاء ہوتا ہے۔ ابن جوزیؒ نے اس کے سوا اور کوئی قول ذکر نہیں کیا، لیکن فی الواقع بات اس طرح نہیں کیوں کہ خواب کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، کبھی نفس کی طرف سے اور کبھی شیطان کی طرف سے۔

علیٰ ہذا القیاس جو کچھ بیداری میں القا ہوتا ہے (اس کی بھی یہی تین قسمیں ہیں)۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بیداری اور خواب دونوں حالتوں میں معصوم ہیں۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی کے شمار میں ہے۔

چناں چہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور عبید بن عمیر رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے۔ عبید رضی اللہ عنہ نے اپنے قول کی تائید میں یہ آیت پڑھی:

﴿ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ ﴾ (الصافات:۳۷/۱۰۲)

''میں خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔''

لیکن ہر شخص کا خواب وحی نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہر شخص کے دل میں جو بات القاء کی جائے وہ وحی نہیں ہوسکتی۔ کبھی انسان کا نفس حالت بیداری میں بہ نسبت حالت نیند کے زیادہ کامل ہوتا ہے۔

---

❶ سنن ابو داؤد، کتاب الاقضیة، باب فی طلب القضاء، رقم:۳۵۷۸۔ سنن ترمذی، کتاب الاحکام، باب ماجاء عن رسول اللہ فی القاضی، رقم:۱۳۲۲

مثلاً نماز پڑھنے والا جب اپنے رب سے مناجات کر رہا ہو تو جس صورت میں نیند کی حالت میں انسان کی طرف وحی ہونا ممکن اور جائز ہے تو یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ حالت بیداری میں وحی ناممکن ہو؟

چناں چہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حواریین (حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متبعین) اور شہد کی مکھی کی طرف وحی کی گئی، لیکن یہ کسی کے لیے جائز نہیں کہ جو کچھ حالت بیداری یا نیند میں اس کے نفس پر القاء ہوا سے مطلقاً وحی کہہ دے۔ ہاں اگر کوئی دلیل اس کے وحی (من جانب اللہ) ہونے کی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ (آج کل) وسواس لوگوں پر غالب ہیں۔

واللہ اعلم

☆☆............☆............☆☆



تفسیر معوذتین (اردو)

تصنیف: امام ابن قیم رحمہ اللہ

مترجم: مولانا عبدالرحیم پشاوری رحمہ اللہ

مرتب: مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ

تخریج: ابوبکر ظفر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے حافظ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ کی تصنیف لطیف ''تفسیر المعوذتین'' کا اردو ترجمہ ہے۔ موضوع کتاب کے نام سے ظاہر ہے، کہ یہ قرآن پاک کی آخری دو سورتوں کی تفسیر اور اس کے متعلقہ مباحث پر مشتمل ہے۔ کتاب کی علمی حیثیت اور اس کے تعارف کے لیے حضرت مصنف رحمہ اللہ کا نام گرامی ہی سب سے بڑی ضخامت ہے۔ آپ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے فیض یافتہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ کی طرح جن مباحث پر قلم اٹھاتے ہیں ان کے متعلق کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑتے۔

کتاب کا اردو ترجمہ حضرت مولانا عبدالرحیم مرحوم پشاوری کا ہے جس میں انہوں نے جاذبیت پیدا کرنے اور عام فہم بنانے کے لیے جابجا جلی اور بغلی سرخیاں بھی قائم کردی ہیں اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں حاشیہ میں مزید وضاحت فرمادی تاکہ ہر عام وخاص اس سے پوری طرح استفادہ کر سکے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ

یہ کتاب آج سے کئی سال قبل ۱۹۲۸ء میں طبع ہوئی تھی، اس کے بعد جلد ہی نایاب ہوگئی۔ کتاب کی افادیت کے پیش نظر ضرورت محسوس کی گئی کہ اسے دوبارہ شائقین تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ کتاب پر سرسری نظر ڈال کی جو سابقہ مطبعی اغلاط محسوس ہوئیں انہیں درست کردیا گیا ہے اور بعض جگہ جزوی سی اصلاح بھی کردی گئی جو ناگزیر تھی۔

وصلی اللہ علیٰ حبیبہ محمد والہ وبارک وسلم تسلما کثیرا.

خادم العلم والعلماء

ارشاد الحق اثری

۱۸ ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ ۷ ستمبر ۱۹۸۲ء

مقدمہ

اکابر امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر میں حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور آپ کے شاگرد رشید حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے صحیح اصول ومبادی کو جس حد تک پیش نظر رکھا ہے اور ٹھیک ٹھیک استعمال کیا ہے اس کی نظیر گذشتہ چھ سات سو سال کی اسلامی تصانیف میں کہیں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان بزرگوں کی عام تصانیف کو علی العموم اور تفسیری تصانیف کو علی الخصوص اسلامی حلقوں میں بڑی قدر ومنزلت حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے قرآن حکیم کی ایک مکمل اور مبسوط تفسیر لکھی تھی جو دست برد زمانہ کی نذر ہوگئی اور آج چند ٹکڑوں کے سوا اس بیش بہا ذخیرہ میں سے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔ مثلاً سورۂ نور، تفسیر سورۂ اخلاص اور تفسیر سورۂ کوثر وغیرہ۔

حافظ ابن قیم، عام تصانیف میں بھی اور تفسیری تصانیف میں بھی اپنے شیخ واستاذ کا نہایت صحیح اور مکمل پرتو تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف کو بھی امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ہی کی وسعت علم ونظر اور اجتہاد فکر وخیال کا ایک بدیع کرشمہ سمجھا جاتا ہے، امام موصوف نے قرآن حکیم کی دو آخری سورتوں یعنی ''معوذتین'' کی ایک مختصر سی تفسیر لکھی تھی جو رسائل کبریٰ میں چھپ گئی ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے مزید تفصیلات کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے معوذتین کی تفسیر کے متعلق ایک مستقل کتاب لکھی، جن میں ان سورتوں کے تمام حقائق ومعارف کو نہایت صاف اور واضح، عمدہ اور سہل انداز میں بیان فرمادیا جو کتاب اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ حافظ رحمہ اللہ کی محولۂ بالا کتاب کا اردو ترجمہ ہے اور اس غرض کو پیش نظر رکھ کر ترجمہ کردیا گیا ہے کہ اردو

دان اصحاب بھی اس نادر ذخیرہ حقائق ومعارف سے آگاہ ہوسکیں۔ کتاب کے مباحث کے متعلق کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے اس لیے کہ اصل کتاب سامنے ہے۔

دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کی بہت سی کتابوں کے چھپوانے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری اس ناچیز اسلامی خدمت کو شرف قبول بخشے۔

ویرحم اللہ عبدا قال آمینا.

عبدالعزیز آفندی

۱۹؍دسمبر ۱۹۲۸ء۔ لاہور

باب۔ ۱

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ وَ آلِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

تفسیر المعوذتین

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۝ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۝ وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۝ وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝ ﴾

﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝ الَّذِیْ يُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ۝ ﴾

صدق الله العظیم

فصل اول

ماجاء فی الحدیث

شانِ نزول:

عقبہ بن عامر سے روایت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: ''کیا تم کو وہ آیتیں معلوم نہیں جو آج کی رات نازل ہوئیں اور جن کی مثال اس سے پہلے نہیں دیکھی گئی۔ وہ آیتیں یہ ہیں:

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ .﴾ ❶

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں: ''آنحضرت ﷺ نے عقبہ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا کیا میں تمہیں وہ کلمات بتاؤں جو ان تمام کلمات سے بہتر ہیں جن کے ذریعے سے کبھی بھی کسی پناہ مانگنے والے نے پناہ مانگی ہے؟'' عقبہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا، جی ہاں یا رسول اللہ! ضرور فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ.﴾ ❷

عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس کو ہر ایک نماز کے بعد معوذتین (سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھنے کا حکم دیا۔ ❸

---

❶ صحیح مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل قراۃ المعوذتین، رقم: ٨١٤/٢٦٤۔ سنن ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی المعوذتین برقم: ٢٩٠٢۔ سنن نسائی، کتاب الاستعاذۃ، باب ماجاء فی سورتی المعوذتین، رقم: ٥٤٤٢۔ مسند احمد (١٤٤/٤) رقم: ١٧٤٣٦

❷ سنن نسائی، کتاب الاستعاذۃ، باب ماجاء فی سورتی المعوذتین، رقم: ٥٤٤٠۔ سنن دارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فی فضل المعوذتین

❸ سنن ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی المعوذتین، رقم: ٢٩٠٣

عبداللہ رضی اللہ عنہ بن حبیب سے روایت ہے، کہ ہم ایک اندھیری رات میں جب کہ بارش ہو رہی تھی اس لئے اپنے گھروں سے نکلے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز ادا کریں، ہم آپ کے حضور پہنچے تو ارشاد ہوا، کہو (کیا کام ہے) میں چپ رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہو؟ میں پھر بھی چپ رہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا: ''صبح وشام قل ھو اللہ احد اور معوذتین پڑھا کرو، تم ہر ایک قسم کے شر سے محفوظ رہو گے۔'' ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔ ❶

ابوہریرہ وابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنوں کے شر سے اور آدمیوں کی نظر بد سے پناہ مانگا کرتے تھے، لیکن جب معوذتین نازل ہوئیں تو آپ نے انہی کا پڑھنا اپنا معمول بنالیا اور دوسری تمام دعاؤں کو چھوڑ دیا۔'' ❷

ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے اور اسی کے ہم معنی ایک حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے۔

خصوصیات:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب سونا چاہتے تھے تو قل ھو اللہ احد اور معوذتین کو پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکتے تھے جس کے بعد اپنے منہ پر اور اپنے جسم کے تمام حصوں پر جہاں تک آپ کا دست مبارک پہنچ سکتا تھا پھیر لیتے تھے۔

---

❶ سنن ترمذی، کتاب الدعوات، باب الدعاء عندالنوم، رقم: ۳۵۷۵۔ سنن ابوداؤد، کتاب الادب، باب مایقول اذا اصبح، رقم: ۵۰۸۲۔ سنن نسائی، کتاب الاستعاذة، باب ماجاء فی سورتی المعوذتین، رقم: ۵۴۳۰

ترمذی کی اصطلاح میں حسن اس حدیث کو کہتے ہیں جس کا سلسلۂ روایت ایک ہی راوی کی روایت تک محدود نہ ہو بلکہ اس مضمون کو مختلف راویوں نے روایت کیا ہو، برخلاف اس کے جب کسی حدیث کا مضمون ایک ہی راوی نے بیان کیا تھا تو اس کو حدیث غریب کہتے ہیں۔ مترجم

❷ سنن ترمذی، کتاب الطب، باب ماجاء فی الرقیة بالمعوذتین، رقم: ۲۰۵۸۔ سنن نسائی، کتاب الاستعاذة، باب الاستعاذة من عین الجان، رقم: ۵۴۹۶۔ سنن ابن ماجه، کتاب الطب، باب من استرقی من العین، رقم: ۳۵۱۱

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آپ بیمار ہوئے تو آپ ﷺ نے مجھ کو ایسا کرنے کا حکم دیا۔“ ❶

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت یونس نے بروایت زہری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث کا آخری حصہ اسی طرح نقل کیا ہے۔

لیکن امام مالک نے بروایت زہری اس طرح نقل کیا ہے کہ آنحضرت جب بیمار ہوتے تھے تب بھی معوذتین پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے تھے، لیکن جب آپ سخت بیمار ہوئے تو میں آپ ﷺ کی طرف سے یہ سورتیں پڑھ کر خود آپ ﷺ کے دست مبارک پر پھونک کر اس کو آپ ﷺ کے جسم پر پھیر دیا کرتی تھی جس سے میرا مقصد حصول برکت تھا۔“ ❷

اسی طرح معمر نے بھی زہری سے اسی کے موافق روایت کی ہے۔ ❸ ❹

معمر کی یہ روایت صحیح بخاری میں ہے اور یہی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے، کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا از خود یہ فعل کیا کرتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس کا حکم نہیں دیا تھا البتہ ایسا کرنے سے منع بھی نہیں فرمایا۔ لہٰذا اس حدیث سے یہ ثابت نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جھاڑ پھونک کا حکم فرمایا تھا۔

ممکن ہے کہ بعض راویوں نے اس کی روایت بالمعنی کی ہو اور راوی کا یہ خیال ہو کہ چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے علم سے ایسا کرتی تھیں اور آپ ﷺ نے اس پر کچھ اعتراض نہیں فرمایا، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ ﷺ نے جھاڑ پھونک کرائی اور یہ بھی ممکن ہے کہ

---

❶ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل المعوذات، رقم:۵۰۱٦۔صحیح مسلم، کتاب السلام، باب رقیۃ المریض بالمعوذات والنفث، رقم:۲۱۹۲/۵۱

❷ ❸ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل المعوذات، رقم:۵۰۱٦۔صحیح مسلم، کتاب السلام، باب رقیۃ المریض بالمعوذات والنفث، رقم:۲۱۹۲/۵۰

❹ جس میں اس بات کا ذکر نہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس بارے میں کوئی حکم دیا ہو۔ مترجم

آنحضرت ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو صرف اتنا حکم دیا ہو کہ وہ آپ ﷺ کے جسم مبارک پر آپ ﷺ ہی کا ہاتھ پھیر دیا کریں، کیونکہ (آنحضرت ﷺ) مرض سے کمزور ہو جانے کے باعث اپنے جسم کے تمام حصوں پر اپنا ہاتھ نہیں پھیر سکتے تھے اس لیے آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حکم دیا کہ وہ اس بارے میں آپ ﷺ کی مدد کریں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنا ہاتھ آں حضرت ﷺ کے جسم مبارک پر پھیرا۔ ❶

تلخیص مضامین:

بہر کیف یہاں پر مقصود ان دونوں سورتوں کا عظیم نفع بیان کرنا ہے اور یہ کہ ہر شخص کے لیے ان کا سیکھنا لازم ہے۔ جادو، نظر بد اور ہر ایک قسم کا شر دفع کرنے کے لیے ان میں عجیب وغریب تاثیر رکھی گئی ہے۔ اگر کسی آدمی کو اپنی زندگی کا سلسلہ قائم رکھنے کے لیے کھانے پینے کی ضرورت ہے تو ان سورتوں کا سیکھنا اور ان کے ذریعہ سے ہر قسم کے شر سے پناہ مانگنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

ان دونوں سورتوں کا مضمون استعاذہ (پناہ مانگنا) ہے جس کے متعلق تین باتوں کا سمجھنا اور یاد رکھنا لازم ہے:

(۱) استعاذہ، یعنی پناہ مانگنا۔

(۲) مستعاذ بہ، یعنی جس کے ساتھ پناہ لی جاتی ہے۔

(۳) مستعاذ منہ، یعنی جس سے پناہ لی جائے۔

ان تینوں کی تفصیل معلوم کر لینے سے ہر سمجھ دار شخص کو ان سورتوں کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔ چناں چہ ان کی تشریح کے لیے الگ الگ بحث کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

---

❶ ایک صحیح حدیث میں آنحضرت ﷺ نے متوکلین کی بعض علامات بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ جھاڑ پھونک نہیں کراتے۔ چونکہ آنحضرت ﷺ یقیناً سید المتوکلین تھے اس لیے مصنف علیہ الرحمۃ اس سے آپ کو بری قرار دینا چاہتے ہیں اور مصنف کے اس قدر طول کلام کا ماحصل یہی ہے۔ (مترجم)

فصل دوم

استعاذہ

معانی:

اس لفظ کا مادہ عوذ ہے جس کا مفہوم لغت میں یہ ہے کہ کوئی چیز جس کو تم پسند نہیں کرتے ہو اس سے بھاگ کر کوئی ایسی پناہ ڈھونڈو جو اس کے شر سے تم کو بچائے۔ [1]

مثال:

ایک لڑکا چلا جا رہا ہے۔ سامنے سے کوئی دشمن اس کو مار ڈالنے کی غرض سے تلوار میان سے کھینچ کر اس پر حملہ آور ہوتا ہے۔ لڑکا یہ حالت دیکھ کر اور خوفزدہ ہو کر بھاگنا شروع کرتا ہے، راستے میں اس کو اپنا مشفق باپ دکھائی دیتا ہے، جسے دیکھتے ہی وہ اس سے چمٹ جاتا ہے اور نجات کے لیے اس کا تمام تر بھروسہ اپنے والد مہربان کی شفقت اور قوت مدافعت پر ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک مسلمان اپنے دشمن ایمان سے بھاگ کر اپنے رحیم خدا کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ بایں ہمہ یہ تمام تشریح صرف سمجھانے کے لیے ہے، ورنہ اس کی حقیقت کی تعبیر سے الفاظ قاصر ہیں۔

استعاذہ کے وقت ایک مؤمن صادق کے دل پر تذلل، التجاء اور تضرع کی جو خاص کیفیت طاری ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو اپنے رب تبارک وتعالیٰ کے سامنے محض بے اختیار سمجھتا ہے اور اس کی تمام تر نظر خدا کی قدرت کاملہ کی کارسازیوں اور رحمت شاملہ کے کرشموں پر ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس کا اظہار الفاظ اور عبارتوں میں نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا تعلق ذوق اور وجدان سے ہے۔

---

[1] اس کے بعد مصنف علام نے عوذ کے مشتقات کو بیان کردہ مفہوم میں استعمال کرنے کی تائید میں ایک حدیث بیان کی ہے پھر اصل مادہ کے مفہوم پر بحث کرتے ہوئے اصل معنی اور مستعمل معنی میں تطبیق پیدا کرنے کی قابل قدر کوشش کی ہے جس کا بالاستیعاب نقل کرنا عام ناظرین کے لیے چنداں دلچسپی کا موجب نہیں ہوگا۔ مترجم)

اسی طرح مؤمن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی سچی محبت اور اس کے خوف وجلال اور ہیبت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا ادراک بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل میں یہ صفات پیدا ہو چکی ہوں۔ وصف اور بیان کا یہاں کچھ کام نہیں۔ چنانچہ ایک کمسن لڑکا بعد از بلوغ کے حالات کا صحیح ادراک نہیں کر سکتا۔ ❶

ایک سوال:

یہ ایک معلوم بات ہے کہ جہاں کلام پاک میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ "قل الحمدلله" اس کی تعمیل الحمدلله کے کہنے سے ہوگی، نہ قل الحمدلله کہنے سے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ معوذتین کی تعمیل کرتے ہوئے

﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴾ اور ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴾

کہا جاتا ہے؟ ❷

جواب:

یہی سوال بعینہٖ ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تھا، جس کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "قِيْلَ لِيْ فَقُلْتُ" مجھ سے یہی کہا گیا اور میں نے اسی طرح کہا۔" ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس لیے ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا۔" اس حدیث کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ ❸

---

❶ اس کے بعد علامہ نے استعاذہ اور استغفار کی لفظی تحقیق کے سلسلہ میں ان کے درمیان ایک دقیق سا فرق بیان کیا ہے جس کا سمجھنا عربیت میں ماہر ہونے کے بغیر دشوار ہے۔ اس لیے ہم اس لفظی تدقیق کو نظر انداز کرتے ہیں۔ مترجم

❷ یعنی تعمیل ارشاد کرتے ہوئے بھی قل کا لفظ حذف نہیں کیا جاتا، بحالیکہ قرین قیاس یہ ہے کہ اس کو حذف کیا جائے۔ مترجم

❸ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة قل اعوذ برب الفلق، رقم: ٤٩٧٦

نیز صحیح بخاری میں ہے کہ زر بن حبیش، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اس طرح مخاطب ہوئے کہ اے ابومنذر! آپ کا بھائی ابن مسعود رضی اللہ عنہ تو کچھ اور کہتا ہے۔ ❶

ابی بن کعب نے کہا کہ میں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے یہی کہا گیا ہے کہ کہو اور میں بھی یہی کہتا ہوں کہ کہو۔ اس لیے ہم بھی اسی طرح کہتے ہیں جیسے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تھا۔ ❷

الغرض آنحضرت ﷺ کے قول کا ملخص یہ ہے کہ مجھ کو بارگاہ الٰہی سے یہی ارشاد ہوا ہے کہ ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴾ اور ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴾ الخ. کہا جائے اس لیے میں انہی الفاظ میں کہتا ہوں جن الفاظ میں مجھ سے کہا گیا۔ اس میں راز یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے قرآن کریم کی تبلیغ میں اپنی طرف سے کچھ بھی تصرف نہیں کیا، بلکہ جو الفاظ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ پر القاء کیے گئے وہی الفاظ آپ ﷺ نے بغیر کسی تصرف کے اپنی امت کو پہنچا دیے اور چونکہ وہ الفاظ جو آپ پر نازل ہوئے یہی تھے کہ ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴾ اور ﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴾ تبلیغ کا پورا حق اسی صورت ادا ہوسکتا تھا کہ آپ بعینہ انہیں الفاظ کو دہرا دیتے، چنانچہ آپ ﷺ نے ایسا ہی کیا۔

آپ ﷺ کے ان الفاظ سے کہ "مجھ سے بھی کہا گیا کہ کہو اور میں نے وہی کہا۔" یہی مراد ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں اپنی طرف سے ایک حرف بھی گھٹاتا اور بڑھاتا نہیں ہوں۔ بلکہ جو کچھ مجھ کو بارگاہ کبریاء سے ارشاد ہوتا ہے اسی کی تبلیغ کرتا ہوں۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة قل اعوذ برب الناس، رقم: ٤٩٧٧

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول تھا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اکرم ﷺ کو اسی طرح مخاطب فرمایا ہے کہ قل تم کہو۔ اس لیے اس ارشاد کی تعمیل حذف قُـــــلْ سے ہوگی یعنی آنحضرت ﷺ کو اور ہم کو تعمیل ارشاد کے لیے اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاس. الخ کہنا ہوگا۔ مترجم

❷ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورة قل اعوذ برب الفلق، رقم: ٤٩٧٦

یعنی یہی شبہ ظاہر کیا تھا کہ ہمیں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاس کہنا چاہیے۔ مترجم

منصب رسالت:

اس میں معتزلہ اور جہمیہ کے قول کی واضح طور پر تردید کی گئی ہے، جن کا یہ خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی کو آنحضرت ﷺ نے اپنی عبارت اور اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشادات الٰہی کو انہیں الفاظ میں ادا کیا ہے جن الفاظ کے ساتھ ان پر وحی نازل ہوئی۔ یہاں تک کہ جب آپ سے کہا گیا کہ قُلْ تو آپ نے بھی اسی امر کا اعادہ کیا اور کہا قُلْ کیوں کہ آپ محض مبلغ اور رسول تھے جن کا منصب ''رسالت'' کا صحیح صحیح پہنچانا ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ اپنی جانب سے اس کے الفاظ میں کسی قسم کا تصرف یعنی ردو بدل کریں۔

فصل سوم

مستعاذ بہ

معانی:

جس کے ساتھ پناہ لی جاتی ہے اسے مستعاذ بہ کہتے ہیں، وہ صرف اللہ تعالیٰ واحد لاشریک ہے۔ جس کی قدرت سے پوچھٹی ہے اور وہ تمام لوگوں کا پرورش کرنے والا، ان کا بادشاہ اور معبود ہے اس کے بغیر اور کوئی جائے پناہ نہیں۔ پناہ مانگنے والوں کو وہی پناہ دیتا ہے اور ہر ایک چیز کے شر سے جس سے وہ پناہ مانگتے ہیں ان کو بچاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں اس حقیقت سے اپنے بندوں کو آگاہ فرمایا ہے کہ جو کوئی اس کو چھوڑ کر کسی مخلوق سے پناہ مانگتا ہے وہ کبھی اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکتا اور مستعاذ بہ کے نزدیک ایسے شخص کا یہ فعل تمرد اور طغیان کا موجب ہوتا ہے۔ چنانچہ مؤمن جنوں کی زبان سے سورۃ الجن میں منقول ہے:

﴿ وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴾ (سورة الجن:٧٢،٦)

''بے شک بنی آدم کے کچھ لوگ بعض جنوں سے پناہ مانگتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے جنوں کی سرکشی بڑھ جاتی تھی۔''

اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں جب کسی مسافر کو بیابان کی کسی سنسان جگہ میں رات بسر کرنے کا اتفاق ہوتا تھا تو وہ جنوں کو اس علاقہ کا متصرف اور مختار سمجھ کر یہ الفاظ زبان پر لاتا تھا:

اعوذ بسید هذا الوادی من شر سفهاء قومه.

''میں اس وادی کے سرداروں کو اپنا جائے پناہ سمجھ کر اس قوم کے بدمعاشوں کی شرارت سے اس کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں۔''

اہل جاہلیت کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے آدمی اپنی رات امن وامان سے بسر کرسکتا ہے اور اس کو کسی قسم کا گزند نہیں پہنچتا۔ اس خیال کو شائع دیکھ کر جنوں کے دل میں ایک طرح غرور اور سرکشی پیدا ہوتی تھی اور وہ کہتے تھے کہ بنی آدم اور جنوں پر ہم یکساں حکومت کرتے ہیں۔

کلام اللہ غیر مخلوق:

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ سے منقول ہے کہ آپ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

((اعوذ بكلمات الله التامات)) ❶

''میں اللہ تعالیٰ کے ان کلمات کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں جو ہر طرح سے کامل ہیں۔''

اہل سنت نے اس حدیث سے استدلال کر کے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام غیر مخلوق ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ سے یہ نہایت بعید ہے کہ وہ کسی مخلوق کے ساتھ پناہ مانگیں، چنانچہ آنحضرت ﷺ کا یہ فرمانا:

((اعوذ برضاك من سخطك و بمعافاتك من عقوبتك.)) ❷

---

❶ صحیح مسلم، کتاب الدعوات، باب فی التعوذ من سوء القضاء رقم:٥٥٠٤/ ٢٧٠٨۔سنن ابو داؤد، کتاب الطب، باب کیف الرقی، رقم:٣٨٩٣

❷ صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب ما یقال فی الرکوع والسجود، رقم:٢٢٢/٤٨٦ سنن ترمذی، کتاب الدعوات، باب دعاء اعوذ برضاك من سخطك، رقم:٣٤٩٣۔سنن ابن ماجه، کتاب الاقامة، باب ماجاء فی القنوت فی الوتر، رقم:١١٧٩

''بارخدایا! میں تیری رضامندی کے ساتھ تیری خوشی سے پناہ مانگتا ہوں۔اور تیرے عذاب کے مقابلے میں تیری بخشش اور معافی کو جائے پناہ ٹھہراتا ہوں۔''

اس بات کی دلیل ہے کہ رضا اور عفو کا شمار اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ میں ہوتا ہے اور ان میں سے ہر ایک صفت غیر مخلوق ہے۔علیٰ ہذا القیاس آپ کا یہ قول:

((اعوذ بعزة الله وقدرته.)) ❶

''میں اللہ تعالیٰ کی عزت اور اس کی قدرت کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں۔'' اور

((اعوذ بنور وجهك الذی اشرقت له الظلمات.)) ❷

''میں تیری ذات پاک کے نور کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں جس کے سامنے تمام تاریکیاں روشنی سے بدل جاتی ہیں۔''

الغرض جس چیز کے ساتھ آپ نے پناہ طلب کی ہے وہ یقیناً غیر مخلوق ہوگی جو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کاملہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔سورۂ فلق اور سورۃ الناس میں جن اسمائے حسنیٰ کو مستعاذ بہ بتایا گیا ہے وہ رب، ملک اور الٰہ کے الفاظ ہیں۔نیز ربوبیت کی اضافت فلق (صبح کی روشنی) اور ناس (لوگ) کی طرف کی گئی ہے۔یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں میں اپنے جو اوصاف بیان فرمائے ہیں وہ استعاذہ مطلوبہ کے ساتھ گہری مناسبت رکھتے ہوں گے کیونکہ ہم نے اپنی تصنیفات میں بارہا اس بات کو واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جب اس کے اسمائے حسنیٰ سے پکارا جائے تو ہمیشہ یہ نقطہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ مدعا اور مطلوب کی مناسبت سے کوئی مناسب اسم پاک استعمال کیا جائے۔ ❸

---

❶ سنن ابو داؤد، كتاب الطب، باب كيف الرقى، رقم: ٣٨٩١۔ سنن ترمذی، كتاب الدعوات، باب فی الرقية اذا اشتكى، رقم: ٣٥٨٨

❷ سیرة النبوية لابن هشام (١/ ٤٢٠)

❸ مثلاً گناہوں کی معافی مطلوب ہو تو غفور رحیم کا استعمال موزوں ہوگا۔رزق کی فراخی کا سوال ہو تو واسع علیم پکارنا مناسب ہے۔دشمن پر فتح چاہتے ہو تو عزیز حکیم کے اسمائے پاک کا دعا کے ساتھ لگانا انسب ہوگا۔مترجم

آنحضرت ﷺ نے ان سورتوں کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

''کسی پناہ مانگنے والے کو ان جیسے کلمات کے ساتھ پناہ مانگنا نصیب نہیں ہوا۔''❶

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن اسمائے پاک کے ساتھ ان سورتوں میں استعاذہ کیا گیا ہے ان کو حصول مطلوب کے ساتھ خاص مناسبت ہے۔ مستعاذ منہ پر بحث کرتے ہوئے اس مناسبت کی توضیح کردی جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فصل چہارم

مستعاذ منہ

معانی واقسام شر:

جن چیزوں سے پناہ مانگی جاتی ہے انہیں مستعاذ منہ کہتے ہیں۔ یہ سب کی سب شر کی قسمیں ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

انسان کو جو برائی پہنچتی ہے وہ دو قسم سے باہر نہیں۔

(الف): ہر ایک قسم کے گناہ جن کا انسان اپنے ارادہ اور اختیار سے ارتکاب کرتا ہے اور جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو دنیا اور آخرت میں سزا ملتی ہے۔ شر کی یہ قسم (گناہ، نافرمانیاں اور ان کے موجبات وبواعث کی) شدید ترین اور پائیدار ہے اور اس سے نجات پانا نہایت دشوار ہے۔

(ب): شر کی دوسری قسم وہ ہے جو انسان کو دوسرے کی طرف سے پیش آتی ہے چاہے وہ دوسرا مکلّف یعنی ذمہ دار ہستی ہو، جیسے انسان اور جن۔ یا غیر مکلّف ہو جیسے زہر دار اشیاء وغیرہ۔

سورۂ فلق اور سورۂ ناس میں نہایت مختصر اور جامع عبارت میں شر کی ان تمام اقسام سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے، چناں چہ سورۂ فلق میں چار باتوں سے پناہ مانگی گئی ہے۔

---

❶ سنن نسائی، کتاب الاستعاذة، باب ماجاء فی سورتی المعوذتین، رقم: ٥٤٤٠۔ سنن دارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فی فضل المعوذتین

(۱): تمام وہ مخلوقات جس سے شر کا صادر ہونا ممکن ہے۔

(۲): شب تاریک کے چھا جانے سے جو شر پیدا ہوتے ہیں۔

(۳): گانٹھوں پر پھونکنے والیوں کے شر انگیز اعمال سے۔

(۴): حسد کرنے والے کے حسد کے برے نتائج سے۔

لیکن ان چاروں کی تفصیل بیان کرنے سے پیشتر شر کے معنی اور اس کی حقیقت کا بیان کرنا لازم ہے۔

شر اور اس کی حقیقت:

شر کا اطلاق درد و تکلیف اور اس کے نتائج واسباب پر ہوتا ہے، چنانچہ کفر وشرک، ظلم وبدعت اور ہر ایک قسم کے گناہ کو...... اگرچہ اس میں اس کے کرنے والے کی کچھ غرض مدنظر ہوتی اور اس کے ارتکاب سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے...... اس لیے شر کہا جاتا ہے کہ ایسی باتوں کے مرتکب کو دنیا یا آخرت میں انہی باتوں کے نتیجہ کے طور پر تکلیف اور عذاب پیش آتا ہے اور آئے گا، کیوں کہ کفر وشرک اور اسی قسم کے دیگر امور اور ان کے عواقب ونتائج یعنی ان کی عقوبت اور عذاب کا آپس میں وہی تعلق ہے جو کسی سبب اور اس کے مسبب کے درمیان ہوتا ہے۔ مثلاً زہر کھانا (بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو) ہمیشہ ہلاکت پر منتج ہوتا ہے۔ ذبح کرنے اور گلا گھونٹنے کا نتیجہ موت ہوتی ہے، اور اگر آدمی آگ میں ہاتھ ڈالے تو لامحالہ اس کا ہاتھ جل جائے گا۔

الغرض ہر ایک سبب کا نتیجہ اس کا مسبب ہوتا ہے بشرطیکہ کوئی مانع پیش نہ آ جائے یا ایک سبب کے ساتھ کوئی دوسرا سبب معارض ہو جائے جو اس سے قوی تر ہے اور جس کا نتیجہ پہلے سبب کے نتیجہ کے برعکس ہو۔ صحت اور مرض کے مضمون پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان کا غور سے مطالعہ کرو، اسباب اور مسبباب کے قانون کو مطرد پاؤ گے۔

عالم اسباب:

اسی طرح روحانی امراض میں بھی یہی سبب اور مسبب کا قانون نافذ ہے اور ہر ایک گناہ

کی عقوبت خاص اس کا مسبب ہے۔ الغرض ذنوب اور معاصی بعینہ اس طرح آخرت میں عذاب اور ہلاکت کا موجب ہوتے ہیں جس طرح اس دنیا میں زہر ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ البتہ اگر کوئی دوسرا سبب معارض ہو یا کوئی مانع پیش آجائے تو ان کا نتیجہ ظہور میں آنے سے رک سکتا ہے۔ (جیسے کہ پہلے ذکر ہوا) مثلاً قوتِ ایمان، کثرت حسنات اور متقیانہ اعمال سے معاصی اور سیئات کی عقوبت سے انسان بچ سکتا ہے جیسے کہ اس دنیا میں بھی جو سبب قوی تر ہو تو اس کا نتیجہ لازماً ظہور میں آتا ہے۔ دنیا اور آخرت میں خدا کا قانون ایک ہے:

﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً ﴾ (فاطر: ۴۳/۳۵)

''اور تم خدا کے قانون میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں پاؤ گے۔''

تمثیل:

معاصی اور سیئات کے ارتکاب میں اگرچہ بظاہر لذت محسوس ہوتی ہے اور اس سے نفس کو فوری خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن اس کی مثال ایک لذیذ کھانے کی ہے جس میں زہر ملایا گیا ہو، بظاہر وہ نہایت مرغوب ہوتا ہے، مگر اس کا انجام کھانے والے کی ہلاکت ہے۔ ذنوب اور معاصی بھی اسی لذیذ مگر مسموم کھانے کی طرح عقوبت اور عذاب کے موجب ہیں۔

گناہ اور عذاب میں سبب اور مسبب کا تعلق ہے اگر بالفرض شریعت مطہرہ نے آدمی کو اس کی عقوبت اور انجام بد سے آگاہ نہ کیا ہوتا تو تب بھی ایک صاحب بصیرت انسان، تجربہ کے ذریعہ سے اور واقعات عالم سے استدلال کر کے اسی نتیجہ پر پہنچتا۔ کیونکہ جب کبھی بھی کسی سے کوئی نعمت زائل ہوتی ہے اس کا مطلب یقیناً اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی ہوگا۔ ارشاد خدائے جل شانہٗ ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءً فَلَا مَرَدَّ لَهٗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴾ (الرعد: ۱۱/۱۳)

''بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی اچھی حالت کو بری حالت سے تبدیل نہیں فرماتا جب تک وہ خود اپنے اعمال میں تبدیلی پیدا نہ کرلیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم

پر عذاب نازل فرمانا چاہتا ہے تو پھر کوئی بھی اس کو ٹال نہیں سکتا اور نہ ہی سوائے اس کے کوئی اور ان کے لیے کارساز ہو سکتا ہے۔''

زوال نعمت کے اسباب:

اللہ تعالیٰ کے کلام پاک میں جن قوموں کی ہلاکت اور ان پر نزول عذاب کا ذکر ہے، اگر کوئی سمجھ دار آدمی ان قصص کو غور سے پڑھے تو ان کو واضح طور پر نظر آجائے گا کہ ہر ایک قوم کی ہلاکت اور عذاب کا سبب اس قوم کی نافرمانی تھی۔ اسی طرح اگر کوئی تاریخی واقعات یا اپنے زمانہ کے احوال پر ایک نظر غائر ڈالے تو اس کو نظر آئے گا کہ زوال نعمت کا اصلی اور حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسولوں کی نافرمانی ہے۔ ایک شاعر نے اس مضمون کو نہایت خوبی کے ساتھ منظوم کیا ہے۔

اِذَا کُنْتَ فِیْ نِعْمَۃٍ فَارِعُھَا
فَاِنَّ الْمَعَاصِیْ تَزِیْلُ النِّعَمُ

''جب تم پر اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت ہو اور تم کسی نعمت کا لطف اٹھا رہے ہو تو اس کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرو (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرو) کیونکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اس کی نعمتوں کے سلب کیے جانے کا سبب ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی نعمت کو برقرار رکھنے کا سب سے بہتر طریقہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی ہے۔ اس نے اپنے کلام مجید میں شکر کو زیادتی نعمت کا موجب بتایا ہے۔ لیکن کیا تم جانتے ہو کہ صرف زبانی الحمدللہ کہنے سے شکرگزاری کا حق ادا ہو جاتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، شکر کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو اس کی اطاعت میں صرف کرے۔

شر کا مفہوم:

خلاصہ کلام یہ ہے کہ معاصی اور سیئات جو دنیا اور آخرت میں عقوبت اور عذاب کا موجب اور عذاب کا سبب ہونے کے باعث شر کے مفہوم میں داخل ہیں۔ باقی رہا اس کا مسبب

یعنی عقوبت اور عذاب، سو اس کا شر کے مفہوم میں داخل ہونا بالکل ظاہر ہے، کیونکہ اس کی عقوبت جسمانی اور روحانی دونوں قسم کے شدید ترین عذاب پر مشتمل ہے۔ روحانی عذاب سے مراد شرمندگی کا احساس، سخت ندامت اور حسرت ہے۔

اگر ایک عقلمند اس کی نوعیت پر کما حقہ غور کرے تو یقیناً وہ اس کے اسباب سے پرہیز کرنا اپنا اولین فرض خیال کرے گا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ آدمیوں کے دل پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے ہیں اور اگر ان کو حقیقت حال پر اطلاع ہوتی تو وہ ایسی باتوں کا ہرگز ارتکاب نہ کرتے جن کے سبب سے وہ نجات سے محروم رہیں یا دنیا اور آخرت کے درجات سے بے بہرہ ہوں۔

آخرت میں جب انکشاف حقیقت ہوگا تو گنہگار اور مجرم چیخیں مار مار کر پکارے گا:

﴿ يَالَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ ﴾ (الفجر:٨٩/٢٤)

''کاش میں اپنی اس ابدی زندگی کے لیے بھی کچھ ذخیرہ کرتا۔''

﴿ يَا حَسْرَتَا عَلٰى مَافَرَّطْتُ فِيْ جَنْبِ اللّٰهِ ﴾

''ہائے افسوس! میں نے اللہ تعالیٰ کے پہلو میں (اس کی آنکھوں کے سامنے رہ کر) کس قدر کوتاہی کی ہے۔''

سرور کونین کا پہلا استعاذہ:

الغرض چونکہ شر کا مفہوم ''درد وتکلیف'' اور اس کے اسباب اور نتائج تک محدود ہے اس لیے آنحضرت ﷺ نے جب کبھی کسی چیز سے پناہ مانگی ہے، وہ ضرور یا تو بذات خود ''درد وتکلیف'' ہوگی یا اس کا موجب۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی عادت تھی کہ عموماً ہر نماز کے آخر میں چار چیزوں سے پناہ مانگتے تھے۔

(۱)......قبر کا عذاب۔

(۲)......دوزخ کا عذاب۔

یہ دونوں چیزیں بذات خود درد وتکلیف بلکہ اس کی شدید ترین صورت ہیں۔

(۳)......زندگی اور موت کا فتنہ۔

(۴)...... مسیح دجال کا فتنہ۔ ❶

یہ دونوں چیزیں ''دردو تکلیف'' اور عذاب کا موجب ہیں، کیونکہ کسی فتنہ کے اثر میں آجانا عذاب کا موجب ہے۔

اس استعاذہ میں دونوں قسم کے فتنہ کا ذکر ہے:

ایک زندگی کا فتنہ، جس کا عذاب بعض اوقات فوراً نازل نہیں ہوتا۔ دوسرے موت کا فتنہ، جس کا عذاب بغیر کسی مہلت کے مفتون پر نازل ہوتا ہے۔ ان اشیائے چہارگانہ سے نماز کے آخر میں پناہ مانگنا نماز کی موکدترین دعاؤں میں سے ہے۔ یہاں تک کہ بعض علمائے سلف اور خلف کا قول ہے کہ جو شخص اپنی نماز میں کے آخر میں یہ استعاذہ ☆ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی ہے۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ اس کو ہر ایک تشہد میں کہنا لازم سمجھتے ہیں اور اس کے ترک کرنے والے پر نماز کا اعادہ واجب خیال کرتے ہیں۔ ❷

سرور کونین کا دوسرا استعاذہ:

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے آخر میں یہ استعاذہ بھی منقول ہے:

((اللهم انى اعوذ بك من الهم و الحزن و العجز و الكسل و الجبن و ضلع الدين و غلبة الرجال.)) ❸

''بار خدایا! میں تیرے ساتھ پناہ لیتا ہوں اندیشہ اور غم سے، بے بسی اور سستی سے، بزدلی اور بخیلی سے، قرض کے بوجھ اور لوگوں کے تغلب سے۔''

---

❶ صحيح بخارى، كتاب الاذان، باب الدعاء قبل السلام، رقم:٨٣٢ صحيح مسلم ، كتاب المساجد، باب مايستعاذ منه الصلاة، رقم:١٢٩/٥٨٩

❷ استعاذہ مذکور کے الفاظ ماثورہ یہ ہیں: اللهم انى اعوذبك من عذاب القبر و عذاب النار و اعوذبك من فتنة المحيا و الممات و اعوذبك من فتنة المسيح الدجال ۔مترجم
صحيح بخارى، كتاب الاذان، باب الدعاء قبل السلام، رقم:٨٣٢ صحيح مسلم ، كتاب المساجد، باب مايستعاذ منه الصلاة، رقم:١٢٩/٥٨٩۔

❸ صحيح بخارى، كتاب الدعوات، باب التعوذ من الجبن و الكسل، رقم:٦٣٦٩

اس استعاذہ میں آنحضرت ﷺ نے آٹھ چیزوں سے پناہ طلب فرمائی ہے جن میں سے دو دو آپس میں مناسبت رکھتی ہیں۔ چناں چہ غم اور اندیشہ کا آپس میں تعلق ہے اور یہ دونوں روحانی تکلیف کی قسم سے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ اندیشہ کے معنی ہیں: مستقبل میں کسی تکلیف کے پیش آنے کا خوف، اور غم کا اطلاق اس احساس پر ہوتا ہے کہ کسی گذشتہ تکلیف کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح بے بسی اور سستی کا آپس میں تعلق ہے۔ بے بسی کسی چیز پر عدم قدرت کا نام ہے، اور سستی کے یہ معنی ہیں کہ انسان کو قدرت حاصل ہو لیکن اس کو استعمال نہ کرے، چوں کہ ان دونوں کا نتیجہ کسی مطلوب کا ہاتھ سے نکل جانا ہوتا ہے، اس لیے ان کا شمار بھی شر کے مفہوم میں ہوتا ہے۔

بزدلی اور بخیلی کا بھی آپس میں ساتھ ہے کیونکہ اول الذکر کے یہ معنی ہیں کہ ایک شخص اپنے بدن اور اپنی قوت کو استعمال نہیں کرتا اور موخر الذکر کے معنی، مال کو استعمال نہ کرنا ہے۔ یہ دونوں ایسی صفتیں ہیں جن سے پناہ مانگنا لازم ہے کیونکہ انسان کو حصول مطالب و مقاصد میں اکثر اوقات دلیری اور شجاعت سے کام لینا پڑتا ہے اور مال خرش کرنا ضروری ہوتا ہے۔[1] اور تم جانتے ہو کہ ادراکِ مطلوب میں جو لذت ہوتی ہے اس سے محروم رہ جانا کس قدر عذاب (عذاب روحانی) کا موجب ہوگا۔

علیٰ ہذا القیاس قرض کے بوجھ اور لوگوں کے تغلب میں ارتباط باہمی موجود ہے اور یہ دونوں چیزیں حصول تکلیف کا باعث ہیں۔ وجہ ارتباط یہ ہے کہ قرض کا بوجھ اکثر آدمی اپنے اختیار سے سر پر لیتا ہے لیکن لوگوں کا تغلب انسان کے بس کی بات نہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ قرض کے بوجھ سے انسان کو جو تکلیف پیش آتی ہے اس میں قرض خواہ حق بجانب ہوتا ہے مگر لوگوں کا تغلب، ظلم اور ناحق ہوتا ہے۔

---

[1] لیکن بزدلی اور بخیلی اس کے منافی ہے اور اس لیے حصول مقصد سے مانع۔

ایک حدیث میں استعاذہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

((اللهم انی اعوذبك من المأثم والمغرم.)) ❶

”بارخدایا! میں تیرے ساتھ گناہ اور قرض سے پناہ مانگتا ہوں۔“

گناہ آخرت میں تکلیف اور عذاب کا باعث ہے اور قرض سے سردست تکلیف آنے کا احتمال ہے۔ ایک اور موقع پر آنحضرت ﷺ نے اس طرح استعاذہ فرمایا ہے:

((اللهم انی اعوذ برضاك من سخطك و بمعافاتك من عقوبتك.)) ❷

”بارخدایا! میں تیری رضامندی کے ساتھ تیری ناخوشی سے پناہ مانگتا ہوں اور تیرے عذاب کے مقابلے میں تیری عفو کو جائے پناہ ٹھہراتا ہوں۔“

اللہ تعالیٰ کی ناراضگی عذاب کا موجب ہے اور عذاب عین تکلیف ہے۔

الغرض مستعاذ منہ وہ چیز جس سے پناہ مانگی جاتی ہے شر ہے اور ہمیشہ کوئی تکلیف یا اس کا سبب اور نتیجہ ہوگا جیسے کہ مندرجہ بالا مثالوں سے اس کی توضیح ہوتی ہے۔

فصل پنجم

مستعاذ منہ کے اقسام

تفصیل:

جس شر سے پناہ مانگی جاتی ہے اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱)......موجود شر جس کا دور کیا جانا مطلوب ہے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الدعاء قبل السلام، رقم:۸۳۲ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب مایستعاذ منه الصلاة، رقم:۱۲۹/۵۸۹

❷ صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب ما یقال فی الرکوع والسجود، رقم:۲۲۲/۴۸۶ سنن ترمذی، کتاب الدعوات، باب دعاء اعوذ برضاك من سخطك، رقم:۳۴۹۳۔ سنن ابن ماجه، کتاب الاقامة، باب ماجاء فی القنوت فی الوتر، رقم:۱۱۷۹

(۲)......معدوم شر جس کا عدم پر باقی رہنا مطلوب ہے۔

اسی طرح اس کے بالمقابل خیر کی بھی دو قسمیں ہیں۔

(۱)......موجود خیر جس کی بقا مطلوب ہے۔

(۲)...... معدوم خیر جس کا وجود میں آنا مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ سے جتنی دعائیں مانگی جاتیں ہیں ان کا دارومدار انہی چار قسموں پر ہے۔ ذیل کی آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ کے بعض خاص بندوں کی زبان سے یہ دعاء منقول ہے۔ انہی انواعِ چہارگانہ پر مشتمل ہے:

﴿ رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ آمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَ کَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا . ﴾ (آل عمران:۳/۱۹۳)

''بارخدایا! ہم نے ایک منادی کوندا کرتے ہوئے سنا کہ اپنے رب تعالیٰ پر ایمان لاؤ اس لیے ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے خدا! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو دور کردے۔''

اس میں موجود شر کے دفع کی درخواست ہے (کیونکہ جیسے پہلے ذکر ہوا گناہ اور معاصی شر کی ایک قسم ہے)۔

﴿ وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ. ﴾ (آل عمران:۳/۱۹۳)

اور ''ہمارے خدا! ہماری موت نیک لوگوں کے ساتھ ہو۔''

اس میں موجود خیر کے بقاء کی التماس کی گئی ہے۔ کیونکہ ایمان ایک عظیم ترین خیر ہے، جو تمام بڑی بڑی نیکیوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہے اور درجات عالیہ کے حصول کا موجب ہے۔

﴿ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ ﴾ (آل عمران:۳/۱۹٤)

''بارخدایا! ہمیں عطا کر جو کچھ تو نے ہمارے لیے اپنے رسولوں کی معرفت وعدہ فرمایا۔''

یہ دعا خیر معدوم کے موجود ہونے کے لیے ہے۔

﴿ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ. ﴾ (آل عمران:٣/١٩٤)

''اور ہمیں قیامت کے دن ذلیل اور شرمندہ نہ بنا۔''

اس میں معدوم شر کے عدم پر باقی رہنے کی استدعا ہے۔

اس سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس آیت کریمہ کے ضمن میں جو دعا خاصان بارگاہ کی زبانی منقول ہے۔ وہ مطالب چہارگانہ کی جامع اور تمام اقسام خیرات پر مشتمل ہے اور مطالب کی ترتیب نہایت عمدہ ہے کیونکہ اس میں دونوں مطالب یعنی مغفرت اور بقائے ایمان کو، جن کا تعلق اس زندگی سے ہے مقدم رکھا گیا ہے، اور اس کے بعد ان دونوں قسموں کا ذکر ہے جس کا حصول آخرت میں ہوگا یعنی یہ کہ جو کچھ ان سے اللہ کے رسولوں نے وعدہ کیا اس سے وہ بہرہ ور ہوں اور روز قیامت کی شرمندگی سے محفوظ رہیں۔ صحیح روایت سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے خطبہ میں اکثر فرمایا کرتے تھے:

((نعوذبالله من شرور انفسنا ومن سيات اعمالنا.)) [1]

''ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے نفس کے شر اور برے اعمال سے پناہ مانگتے ہیں۔''

اس میں نفس کے شر سے پناہ طلب کی گئی ہے جس میں کہ بالقوۃ ہر ایک شر کا مادہ موجود ہے۔ بالفاظ دیگر معدوم شر کے ظہور میں نہ آنے کی دعا ہے، نیز برے اعمال سے پناہ طلب کی ہے جو موجود شر کی ایک بڑی قسم ہے۔ گویا اس استعاذہ میں شر کے دونوں اقسام سے پناہ مانگنے کی تصریح ہے۔

''سیئات اعمال'' سے بعض علماء اور شارحین حدیث کے نزدیک اعمال غیر صالحہ کی عقوبت اور عذاب مراد ہے، جس کو سیئات کے لفظ سے اس واسطے تعبیر کیا گیا ہے کہ اس کا وقوع اس کے مستوجب کو برا معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں سبب اور مسبب دونوں کو مستعاذ منہ قرار دیا ہے، نفس کا سبب شر ہے اور عذاب اس کا مسبب۔

---

[1] سنن ترمذی، کتاب النکاح، باب ماجاء فی خطبة النکاح، رقم:١١٠٥۔ سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب خطبة النکاح، رقم:١٨٩٢

سیئات اعمال:

سیئات اعمال کی تشریح میں یہ دونوں توجیہیں احتمال رکھتی ہیں اور ہر ایک کی تائید میں ایک معقول دلیل موجود ہے۔علماء کی جس جماعت نے سیئات اعمال سے برے اعمال مراد لیے ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ برے اعمال کا منشاء نفس کی پوشیدہ شرارت ہے اور موخرالذکر یہ تمام برے اعمال کی تولید کا حقیقی سبب ہے۔ گویا حدیث نبوی ﷺ کے ان الفاظ میں نفس کی صفت مذمومہ اور اس کے نتائج بد، دونوں سے استعاذہ کیا گیا ہے کیونکہ ان دونوں سے محفوظ ہونا تمام شرور سے محفوظ رہنے کے مترادف ہے۔

دوسرے فریق کے نزدیک جس کا یہ قول ہے کہ سیئات اعمال سے مراد برے اعمال کی عقوبت اور عذاب ہے۔ ترجیح کی وجہ یہ ہے کہ بہر حال عقوبت اور عذاب شرور نفس کا نتیجہ ہے اور ان دونوں میں سبب اور مسبب کا تعلق ہے۔ گویا ہر ایک قسم کی عقوبت اور اس کے اسباب سے استعاذہ کیا گیا ہے۔

فصل ششم

اسباب شر کا مبداء ومنتھی

شر کی چار قسمیں:

چونکہ یہ ضروری ہے کہ شر کے لیے کوئی سبب ہو جس سے وہ پیدا ہوا، نیز اس کے لیے ایک انتہاء اور انجام ہو۔ چوں کہ سبب کا وجود یا تو خود انسان کی ذات میں ہوگا، یا اس سے خارج کسی اور چیز میں، اور اس کا انتہاء اور انجام بھی یا خود اس کی ذات پر ہوگا یا کسی اور چیز پر۔ اس لیے مفصلہ بالا تقسیم کے بموجب شر کی چار قسمیں ہوئیں جن کو ماثور استعاذہ نے نہایت خوبی کے ساتھ جمع کیا ہے جو آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سکھلایا تھا اور صبح وشام اور سونے کے وقت اس کے دوہرانے کی تاکید فرمائی تھی:

((اللھم فاطر السموات والارض۔ عالم الغیب والشھادۃ رب کل شیء

ومـلـكـه اشهـد ان لا الـه الا انـت اعوذبك۔ من شر نفسی و شرالشیطن وشر که ان اقترف علی نفسی سوء ا او اجره الی مسلم۔)) [1]

''بار خدایا! آسمان اورزمین کے پیدا کرنے والے! پوشیدہ اورظاہر کے جاننے والے! ہرایک چیز کے مالک اور پرورش کرنے والے! میں اس بات کا اقرار کرتا اور گواہی دیتا ہوں کہ سوائے تیرے کوئی معبود نہیں، میں تیرے ساتھ اپنے نفس کے شراورشیطان کے شر سے اوراس کے میرے ساتھ اعمال میں شریک ہونے کے شر سے پناہ مانگتا ہوں نیز اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں اپنے نفس پرضرر پہنچانے کے لیے کوئی برا عمل کروں یا کسی دوسرے مسلمان کوتکلیف میں مبتلا کروں۔''

اس استعاذہ میں شر کے اصلی سبب نفس اور شیطان کا ذکر ہے اوراس بات کا بھی ذکر ہے کہ اس کا انجام کبھی تو خود انسان کے اپنے نفس پر ہوتا ہے اور کبھی اس کے مسلمان بھائی پر الغرض یہ باوجوداختصار کے ایک جامع استعاذہ ہے۔

فصل ہفتم

شرور جن کا معوذتین میں ذکر ہے

افعال اللہ خیر محض ہیں!

اب ہم ان شرور پر مفصل بحث کرتے ہیں جن کا ذکر سورۂ فلق اور سورۂ ناس میں ہے۔

پہلی آیت:

﴿ مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ. ﴾

''میں پناہ مانگتا ہوں ہرایک ایسی چیز کے شر سے جس کواس نے پیدا کیا۔''

---

[1] سنن ترمذی، کتاب الدعوات، باب دعاء علمه ابا بکر، رقم:۳۵۲۹۔مسند احمد، (۱/ ۱۰،۱۰)رقم: ٦٣ ۔ سنن ابوداؤد، کتاب الادب،باب مایقول اذا اصبح، رقم:٥٠٦٧

اس میں عام شر کا ذکر ہے اور شر کی نسبت اس مخلوق کی طرف ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔

اللہ تعالیٰ کی کسی صفت مثلاً خلق وغیرہ کی طرف اس کی نسبت نہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت یا فعل میں کسی طرح کا شر نہیں اور جیسے کہ اس کی ذات مقدس، ہر ایک شر کی نسبت اور اضافت سے برتر اور منزہ ہے اسی طرح اس کی صفات اور اس کے الفاظ اور اس کے افعال کی تنزیہ بھی واجب ہے۔ اس کی ذات اور اس کی صفات میں کسی قسم کا عیب اور نقص نہیں اور اسی طرح اس کے تمام افعال خیر محض ہیں، جن میں شر کی مطلق آمیزش نہیں۔ دنیا میں جو کچھ بھی شر پایا جاتا ہے وہ مخلوق ہی کی طرف منسوب ہے۔ اگر بفرض محال جناب کبریا تعالیٰ وتقدس کے افعال میں کسی قسم کا شر ہوتا تو ضرور تھا کہ اس شر کے لفظ سے اس کے لیے اسم صفت بنایا جاتا جیسے کہ دوسرے اسماء حسنیٰ بنے ہیں اور اس صورت میں یہ کہنا غلط ہوتا:

﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ (اعراف:۷/ ۱۸۰)

''اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خوبصورت سے خوبصورت نام مقرر کیے گئے (سب نام اس کے احسن الاسماء ہیں)۔''

انتساب شر:

تمہارے دل میں یہ وہم پیدا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو جو عقوبت اور عذاب کے مستحق ہیں، عقوبت اور عذاب دیتا ہے کیونکہ اس کا ایسا کرنا عین عدل وانصاف اور خیر محض ہے۔ جناب کبریائے تعالیٰ وتقدس کا یہ فعل شر کی آمیزش سے بالکلیہ پاک ہے (اگرچہ شر درد وتکلیف کا نام ہے) کیونکہ اس کا شر ہونا انہیں مستحقین عقوبت کے حق میں ہے۔ اور بس۔ الغرض شر کا وجود اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے افعال سے بالکل الگ اور علیحدہ اس کی مخلوقات اور مفعولات میں پایا جاتا ہے اور اسی لحاظ سے اس کو خالق خیر وشر کہہ سکتے اور کہتے ہیں۔

یہ دقیق مسئلہ ہے اور اس لیے اس مقام پر دو باتوں کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے:

(۱) یہ کہ جو چیز بذات خود شر ہے یا شر پر مشتمل ہے وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور

افعال سے منفصل کوئی مفعول اور مخلوق چیز ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کی صفت یا اس کا فعل ہرگز نہیں ہوگا۔

(۲) یہ کہ اس کا شر ہونا ایک امر اضافی ہوگا۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کی جائے تو وہ خیر محض نظر آئے گا۔ البتہ کسی مخلوق کی طرف اس کی نسبت کی جائے تو وہ شر کی صورت میں ظاہر ہوسکتا ہے۔

شر امر نسبی ہے!

یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کا ہر ایک فعل (خواہ وہ مخلوق کے حق میں کتنا ہی بڑا شر ہو) کسی حکمت بالغہ پر مبنی ہوتا ہے۔ جس کے ادراک ماہیت سے اکثروں کی عقل رسا قاصر رہتی ہے اس لیے عموماً ایسے موقعوں پر یہ مجمل ایمان کافی ہوتا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴾ (لقمان: ۳۱/ ۲۶)

''بے شک اللہ تعالیٰ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفتوں کا قائل ہونا اس کی طرف کسی شر کو منسوب کرنے کا منافی ہے کیونکہ جو کوئی شر کا فاعل ہوتا ہے اس کا یہ فعل یا تو اس کے احتیاج کا نتیجہ ہوتا ہے یا اس کے ناقص اور عیب ناک ہونے کی وجہ سے اس سے اس قسم کا فعل ظہور میں آتا ہے۔ لیکن جس ذات مقدس کی صفت الغنی الحمید ہے اس سے کسی ایسے فعل کا صادر ہونا ناممکن ہے۔

اس تقریر کا ملخص یہ ہے کہ ہر حالت میں شر ایک امر اضافی ہوتا ہے اور اگر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے دیکھا جائے تو وہ خیر محض ہوگا۔ یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس کا یاد رکھنا تمہارے لیے معرفت رب تعالیٰ کا ایک دروازہ کھول دے گا۔ تم کو اس کی محبت کی جانب رہنمائی کرے گا اور تمہارے دل سے وہ شبہات دور ہو جائیں گے جس میں پڑ کر اکثر لوگوں کی عقل چکرا جاتی ہے، اس مبحث کو ہم نے کتاب تحفۂ مکیہ اور الفتح القدس میں بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اس کی توضیح کے لیے چند مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

امر نسبی کی تمثیلات:

ایک شخص چوری کرتا ہے، اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے یا اس کو سخت قید کی سزا دی جاتی ہے۔ حاکم کا یہ فعل اس چور کے حق میں شر ہے لیکن عام لوگوں کے حق میں اور فی حد ذاتہ خیر محض ہے۔ کیوں کہ لوگوں کے مال کو بدمعاشوں کی دست درازی سے محفوظ رکھنے کی یہ ایک مؤثر تدبیر ہے اور عامۃ الناس کے ساتھ ایک بڑی نیکی ہے۔ اس لیے حاکم کا یہ فعل عقلمندوں کے لیے مستحق ہزار آفرین ہے اور ایسا حاکم جو بدمعاشوں اور اچکوں کو کیفر کردار تک پہنچائے، محبوب خلائق اور ہر دلعزیز ہوگا۔

اسی طرح جو شخص لوگوں کی جان اور آبرو پر حملہ کرتا ہے اس کو مناسب سزا دینا ہر طرح سے مستحسن اور قابل تعریف ہے۔ اب تم خود سمجھ لو کہ لوگوں کے جان و مال اور آبرو پر حملہ کرنے والے کو سزا دینا معیوب نہیں بلکہ مستحسن ہے جس کے نتائج اسی دنیاوی زندگی تک محدود رہتے ہیں۔ تو کیا وہ شخص یا اشخاص عقوبت اور عذاب کے مستحق نہیں جو لوگوں کی روحانی زندگی کو تلف کرنا چاہتے ہیں جس کے نتائج دور رس اور اس کا اثر انسان کی حیات ابدی پر پڑتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اپنے رسولوں کی معرفت لوگوں کی اصلاح کے لیے بھیجی ہے اور جس سے دونوں جہان کی سعادت حاصل ہوتی ہے وہ لوگ اس سے لوگوں کو روکتے ہیں۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ﴾ (اعراف:۷/ ۴۵)

''جو اللہ کی راہ سے روکتے اور اس سے ٹیڑھی راہ اختیار کرتے ہیں۔''

کیا ایسے مضر انسان کو اس کے کیفر کردار تک پہنچانا خیر محض اور خالص عدل نہیں ہوگا؟ چاہے ایسا کرنا خود اس مضر ہستی کے حق میں کتنا بڑا شر ہو۔

مسئلہ تقدیر کا راز:

اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو جس سے مسئلہ تقدیر کا راز کھل سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت میں تمہیں بصیرت حاصل ہوسکتی ہے اور یہ کہ وہ اپنے بندوں کے حال پر بہرکیف مہربان ہے، البتہ جیسے وہ مہربان اور محسن ہے اسی طرح وہ حکیم اور عادل ہے، اس کی حکمت اس

کی رحمت کے منافی نہیں، وہ اپنی صفت رحمت اور احسان کو اپنی مناسب جگہ پر جلوہ دیتا ہے اور عدل وانتقام کی صفت کا اپنی مناسب جگہ اظہار فرماتا ہے:

﴿ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ. ﴾

''وہ غالب ہے جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے اور حکیم ہے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔''

اس لیے اس کے تمام افعال خیر محض ہیں اس کی حکمت کے برخلاف ہوگا اگر وہ عقوبت اورغضب کے محل میں رحمت اور رضا کی صفت کوجلوہ دے یا رحمت کی جگہ غضب کا اظہار فرمائے۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دونوں امر اللہ تعالیٰ کے حق میں برابر ہیں اور اس کے افعال میں محض مشیت کارفرما ہے، سبب اور مسبب کے قانون اور حکمت بالغہ کی کرشمہ آرائیوں کو اس میں کچھ بھی دخل نہیں، ان کے دلوں پر ایک غلیظ حجاب ہے، اس لیے ان کو تمام چیزیں اندھوں کی طرح نظر آتی ہیں۔

حکمت بالغہ:

اگر قرآن کریم کو شروع سے آخر تک غور کے ساتھ پڑھو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ کلام پاک میں سبب اور مسبب کے اٹل قانون پر کس قدر زور دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال میں حکمت بالغہ کے جلوہ گر ہونے پر انسان کو کہاں تک توجہ دلائی گئی ہے۔ کلام مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ مَالَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴾

(القلم:٦٨/ ٣٥، ٣٦)

''کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اپنے مطیع فرمان بندوں کے ساتھ مجرموں کا سا سلوک کریں؟ تمہاری عقل پر کیا پتھر پڑ گئے ہیں! تم کیسا متحکمانہ حکم صادر کر رہے ہو!!۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ اٰمَنُوا

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُونَ.﴾

(الجاثیہ:٤٥/ ٢١)

''کیا وہ لوگ جو برائیاں کررہے ہیں یہ غلط خیال رکھتے ہیں کہ ہم ان سے ان لوگوں کا سا سلوک کریں گے جو ایمان لائے اور نیکیاں کی ہیں، ان کی زندگی اوران کی موت برابر ہوگی؟ (اگر ان کا یہ خیال ہے تو) نہایت ہی براحکم صادر کر رہے ہیں۔''

اس قسم کی بیسیوں اورسینکڑوں آیتیں کلام پاک میں موجود ہیں،جن میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کے اس گمان کوسختی کے ساتھ باطل فرمایا ہے کہ وہ اپنے نیک اور بداعمال بندوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرے گا؟ اس طریق استدلال سے صاف واضح ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ حقیقت منقوش ہے اورعقل سلیم کا یہی فتویٰ ہے،اللہ تعالیٰ کے قانون حکمت کا یہ مقتضاء ہرگزنہیں کہ فرماں بردار اور بے فرمان کوایک ہی لاٹھی سے ہانکا جائے تمام بنی نوع انسان کے عقول میں فطرتاً یہ بات مرکوز ہے کہ رحمت اوراحسان کی جگہ عقوبت اورعذاب کارکھنا نہایت برا ہے،اوراگرکوئی ایسا کرے تو اس کے اس فعل کوسخت قابل اعتراض سمجھا جائے گا۔ اسی طرح عقوبت اور انتقام کے مناسب موقعوں پررحمت اوراحسان کا استعمال فطرتاً نہایت قبیح معلوم ہوتا ہے۔

مشاہدہ:

ایک شخص لوگوں کے جان ومال پرناحق دست درازی کرتا ہے اوران کی آبروریزی میں کوتاہی نہیں کرتا۔لیکن ایک دوسرا شخص ہے جواس قسم کے آدمی کے ساتھ اہانت اورتحقیر کاسلوک کرنے کے بجائے نہایت تعظیم اوراحترام سے پیش آتا ہےاوراس کے ساتھ احسان کرنے میں دریغ نہیں کرتا تو کیاکوئی سلیم الفطرۃ انسان اس کے اس فعل کومستحسن سمجھ سکتا ہے۔حاشا وکلا۔ ہرایک شخص اس بیجا احسان کرنے والے کونہایت براخیال کرے گا اوراس کے اس فعل کو یقیناً

قبیح سمجھا جائے گا۔ یہی اللہ تعالیٰ کی فطرت ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے بایں ہمہ عقلوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عدل وانتقام کے افعال میں اس کی حکمت بالغہ کا مشاہدہ نہیں کر سکتے؟ کسی شاعر نے کیا اچھا فرمایا ہے:۔

نعمت الله لا تعاب ولكن

ربما استقبحت على اقوام

یعنی ''اللہ تعالیٰ کی نعمتیں عیب سے مبرا ہیں، لیکن بعض موقعوں پر ان کا انعام زیبا نہیں معلوم ہوتا۔''

تہدید:

الغرض وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے کسی طرح مستحق نہیں جو اس کے سبیل ہدایت پر چلنے سے دوسرے لوگوں کو روکتے ہیں، اس کی رضامندی کے مخالف امور میں کوشش کرتے ہیں۔ جن امور سے وہ ناخوش ہوتا ہے اس کو بنظر پسندیدگی دیکھتے ہیں اور جن باتوں میں اس کی رضامندی متصور ہے ان سے بے اعتنائی برتتے ہیں بلکہ دوسری نظر سے ان کو ملاحظہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی کچھ بھی پرواہ نہیں کرتے لیکن اغیار کو خوش کرنے کے لیے ایڑی چوٹی تک کا زور لگاتے ہیں۔ الغرض وہ ہر ایک بات میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے فرمان کے عین ضد پر عمل کرتے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے پیارے ہیں وہ ان کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں، اور جن کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں سے عداوت ہے ان کو ان سے محبت ہے۔

﴿ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴾ (فرقان:۲۵/ ۵۵)

''کافر انسان ہمیشہ اپنے رب تعالیٰ کی مخالفت میں کوشاں رہتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ اپنے کلام مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ﴾ (الکہف:۱۸/ ۵۰)

''اس قصہ کو یاد کرو جب کہ ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ تعمیل فرمان کے لیے سب نے سجدہ کیا مگر ایک شیطان نے نہ کیا وہ جنوں کی قوم سے تھا اس لیے اس نے اپنے رب تعالیٰ کے حکم سے سرتابی کی، کیا (بایں ہمہ) تم مجھ کو چھوڑ کر اس کو اور اس کی اولاد کو اپنا دوست سمجھتے ہو؟ بحالیکہ وہ تمہارے دشمن ہیں ظالموں کے لیے (جو مستحق عداوت کو دوست بنا کر ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دشمن شیطان کے ساتھ رشتہ جوڑتے ہیں) نہایت ہی برا بدلہ ہے۔''

اس خطاب کے ضمن میں غایۃ درجہ کی تہدید ہے۔ آیت کریمہ کے شروع میں یہ بتایا گیا ہے کہ میں نے شیطان لعین کو تمہارے باپ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا جس سے اس نے سرتابی کی، اس پر میں نے اس کو اپنی بارگاہ کبریائی سے مردود فرما کر لعین کا خطاب دیا اور تمہارے باپ کے لیے سجدہ سے انکار کی وجہ سے اس کو اپنا دشمن ٹھہرایا۔ لیکن تم ہو کہ اسی ملعون کو اپنا دوست سمجھ رہے ہو اور اس کی خاطر مجھ کو چھوڑ رہے ہو۔ کیا یہ عظیم ترین ظلم نہیں؟ اور جب قیامت کے دن انکشاف حقیقت ہوگا تو کیا تم اپنے کیے پر سخت نادم اور متاسف نہیں ہو گے؟۔

میدان قیامت:

یقیناً قیامت کے دن تم سے یہ کہا جائے گا (جس کے تم ہر طرح سے مستحق ہو) کیا عدل وانصاف کا یہ تقاضا نہیں کہ ہر ایک شخص کو تم میں سے اس کا رفیق بنا دیا جائے جس کو تم نے خود اپنے لیے رفیق منتخب کیا تھا۔ اسی طرح اولیاء الشیطان کی جماعت میں شریک ہو کر دوزخ کو چلے جائیں گے، مگر اولیاء الرحمٰن کسی دوسرے کے پیچھے چلنے سے انکار کریں گے۔ کیونکہ انہوں نے دنیا میں بھی دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر ایک خدا کی فرماں برداری اختیار کی تھی۔

حدیث شریف میں ہے کہ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ ان کے سامنے جلوہ فرما ہو کر ان سے اس طرح مخاطب ہوگا:

''تم بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ کیوں نہیں چلے گئے!''

اس کے جواب میں وہ عرض کریں گے:

''بار خدایا! دنیا میں جب کہ ہمیں ان کے ساتھ ربط وضبط رکھنے کی سخت ضرورت تھی۔ صرف تیری ہی خاطر ان کو چھوڑ دیا تھا تو بھلا اب آخرت میں ہم کیوں ان کے پیچھے جانے لگے؟ ''ہم تو اپنے رب تعالیٰ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' (وہی جہاں ہم کو بھیجے گا ہم خوش ہیں) اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا، ''کیا تمہارے اور اس کے درمیان کوئی خاص علامت بھی ہے! عرض کریں گے ہاں! اس کی مثل نہیں ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایسی کیفیت کے ساتھ جلوہ فرما ہوگا کہ ان کا کوئی شک باقی نہیں رہے گا اور اس حالت میں وہ سب سربسجود ہوں گے۔ الخ۔''[1]

اس دن خدا کے ساتھ سچی محبت رکھنے والوں کی آنکھیں ہوں گی اور کافروں اور مشرکوں کو اس بات کا عین الیقین حاصل ہوگا:

﴿ اِنْ اَوْلِيَاۤؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (الانفال:٨/٣٤)

''اللہ کے دوست وہی ہوتے ہیں جو تقویٰ کے زیور سے آراستہ ہوں۔''

فصل ہشتم

خیر الکلام وخیر العباد کا تنزیہ تقدیس

ذات باری تعالیٰ:

بعض عارفوں نے اس طرح اللہ تعالیٰ کی شر سے تنزیہ بیان کی ہے کہ الشر لایتقرب به الیك (شر کے ذریعے کوئی شخص تیرا قرب حاصل نہیں کرسکتا) اور عارف نے اس کے تقدس کا ان لفظوں میں اظہار کیا ہے کہ الشر لا یصعد الیك (شر کو تیری طرف صعود نہیں ہے) اپنی بساط کے موافق ہر ایک نے اس کی تنزیہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن آنحضرت ﷺ نے جن الفاظ میں جناب کبریائے تعالیٰ وتقدس کی تنزیہ فرمائی ہے، وہ ان تمام عبارتوں سے اعلیٰ وارفع ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ تعالی: وجوه یومئذ ناظرة الی ربها ناظرة

حدیث نبوی ﷺ:

آنحضرت ﷺ اکثر فرمایا کرتے تھے:

((لبيك و سعديك و الخير كله في يديك و الشر ليس اليك.)) ❶

"یہ بندہ نیاز مند تیری خدمت میں حاضر ہے، اس کو اعتراف ہے کہ تمام نیکیاں تیرے ہاتھ میں ہیں اور شر کو تیری طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔"

حدیث کی الفاظ میں اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور اس کے افعال شر کی آمیزش سے مبرا ہیں اور کسی صورت میں شر کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ گو اس کی مخلوقات میں شر کا وجود پایا جاتا ہے جو بالکلیہ انہیں کی طرف منسوب ہے۔

شر کی اضافت:

چناں چہ سورۂ فلق کی پہلی آیت من شر ما خلق میں اس بات کی تصریح موجود ہے، شاید تم نے قرآن کریم کے طرز پر بہت کم غور کیا ہوگا ورنہ تمہیں صاف نظر آجاتا کہ اس کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت:

کلام پاک میں شر کی اضافت کبھی تو اس کے سبب کی طرف ہوتی ہے اور کبھی جس کی ذات سے شر کو قیام حاصل ہے اسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، مثلاً:

﴿ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. ﴾ (البقرة:٢/٢٥٤)

"اور منکر ہی تو ظلم کرنے والے ہیں۔"

﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ. ﴾ (المائدہ:٥/١٠٨)

"جو قوم کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر اڑی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت نہیں بخشتا۔"

یہودیوں کا حال بیان فرما کر ارشاد ہوتا ہے:

---

❶ صحیح مسلم، کتاب المسافرین، باب صلاة النبی و دعائه باللیل، رقم:٧٧١/٢٠١

﴿ وَمَا جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ. ﴾ (الانعام:٦/١٤٦)

''یہ عقوبت ہم نے ان پر ان کے ظلم کی وجہ سے نازل فرمائی۔''

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ وَمَاظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ. ﴾ (زخرف:٤٣/٧٦)

''ہم نے ان پر مطلق ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی ظلم کرنے والے تھے۔''

یہ چند آیتیں صرف بطور نمونہ لکھی گئی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تمام قرآن کریم اس مضمون سے بھرا ہوا ہے۔

دوسری صورت:

یہ ہے کہ شر کی اضافت کسی طرف بھی نہ ہو بلکہ مجہول کے صیغہ سے اس کو بیان کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ آیت جس میں مؤمن جنوں کا قول منقول ہے

﴿ وَاَنَّا لَانَدْرِیْ اَشَرٌّ اُرِيْدُ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ .... ﴾ (الجن:٧٢/١٠)

''ہم یہ نہیں جانتے کہ یہ کس قسم کا شر ہے جس کا اہل زمین کو پہنچانا مقصود ہے یا ان کے رب تعالیٰ نے ان کو ہدایت دینے کا قصد فرمایا ہے۔''

ہدایت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے لیکن شر کی نسبت کو مجہول رکھا گیا ہے۔ اس کی تفسیر سورۂ فاتحہ میں ہے کہ انعام واکرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن غضب کا اسناد مجہول ہے۔

﴿ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ﴾ (الفاتحة:١/٦-٧)

''ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، نہ ان کا جن پر ناراضی کی گئی۔''

حضرت خضر علیہ السلام کا قول:

اسی طرح حضرت خضر علیہ السلام کے قصہ میں خضر علیہ السلام نے اپنے افعال کی اہمیت بتاتے ہوئے جہاں کشتی کے توڑنے کا ذکر کیا ہے اس کو اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ:

﴿ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا. ﴾ (الکھف:١٨/٧٩)

''میں نے یہ چاہا کہ اس کو عیب لگا دوں۔''

لیکن یتیموں کی دیوار کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿ فَاَرَادَ رَبُّکَ اَنْ یَّبْلُغَا اَشُدَّھُمَا وَیَسْتَخْرِجَا کَنْزَھُمَا ﴾ (الکھف:۱۸:۸۲)

''اس لیے تمہارے رب نے ارادہ فرمایا کہ وہ دونوں یتیم اپنی بلوغت کی حد کو پہنچ کر اپنا خزانہ نکال لیں۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَهٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ﴾ (الحجرات:۴۹/۷)

''لیکن اللہ تعالیٰ ہی نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈال دی اور اس کو تمہارے دلوں میں زینت دی۔''

دوسری جگہ فرماتا ہے:

﴿ زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوَاتِ. ﴾ (آل عمران:۳/۱۴)

''لوگوں کے دلوں میں خواہشات نفسانی کو زینت دی گئی ہے۔''

اول الذکر آیت میں زینت کا فاعل مذکور ہے کیونکہ یہ تزئین خیر محض ہے، لیکن دوسری آیت میں فعل مجہول استعمال کیا گیا ہے کیونکہ یہ تزئین شر پر مشتمل ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول:

حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام اپنے رب جلیل کی صفات عالی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

﴿ اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَھُوَ یَھْدِیْنِ وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَامَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴾ (الشعراء:۲۶/۷۸ تا ۸۲)

''وہ خدا جس نے مجھ کو پیدا کیا وہی مجھ کو ہدایت دے گا۔ وہی خدا ہے جو مجھ کو کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے۔ وہی خدا ہے جو مجھ کو موت دے گا اور پھر مجھ کو زندہ کرے گا۔ وہی خدا ہے جس سے میں امید رکھتا

ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہوں کو بخش دے گا۔''

اس میں جو خیر وکمال کے مظاہر ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں لیکن نقص وعیب کی باتیں مثلاً مرض اور گناہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی طرف منسوب کی ہیں، کیونکہ والشر لیس الیك۔ اس قسم کی مثالیں کلام مجید میں بکثرت پائی جاتی ہیں جن کو ہم نے ''الفوائد المکیہ'' میں بالتفصیل بیان کیا ہے اور یہ نکتہ بھی لکھا ہے کہ الذین اتینھم الکتاب (بصیغہ معروف) اور الذین اوتوا الکتاب (بصیغہ مجہول) کا باہمی فرق اسی اصول پر مبنی ہے۔ فعل معروف مدح کے مقام پر استعمال ہوا ہے اور فعل مجہول ذم کی جگہوں میں ارشاد ہوا ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا. ﴾ (فاطر:٣٥/٣٢)

''پھر اپنے چنے ہوئے بندوں کو ہم نے کتاب کا وارث بنایا۔''

اس کے مقابل دوسری جگہ فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴾

(الشوریٰ:٤٢/١٤)

''وہ لوگ جن کو ان کے بعد کتاب کا وارث بنایا گیا، ایک قوی شک میں پڑے ہیں۔''

بہر کیف عالم میں جہاں کہیں بھی خیر وکمال ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے برعکس اس کے شر اور نقصان کی نسبت سے اس کی ذات، اس کی صفات اور اس کے افعال منزہ اور برتر ہیں۔



باب۲

تفسیر سورۃ الفلق

﴿ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ o مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ o وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ o وَ مِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ o وَ مِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ o ﴾

''کہہ! میں روشنی صبح کے مالک خدا کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں، ہر ایک قسم کے شر سے (میں پناہ مانگتا ہوں) جو کسی مخلوق میں پایا جائے، اور شب تاریک کے شر سے (میں پناہ مانگتا ہوں) جب کہ وہ چھا جاتی ہے اور گانٹھوں پر پھونکنے والی جماعتوں (جادوگر) کے شر سے (میں پناہ مانگتا ہوں) اور حاسد کے شر سے (میں پناہ مانگتا ہوں) جب کہ وہ حسد کرتا ہے۔''

فصل اول

شر کی پہلی قسم

استعاذہ من شر ماخلق:

ہر ایک قسم کا شر جو کسی مخلوق میں پایا جاتا ہے: مِنْ شَرِّ مَاخَلَقَ کے مفہوم میں داخل ہے۔

ماخلق سے مراد:

کسی مخلوق کا لفظ انسان، جن، جملہ حیوانات، حشرات الارض، آندھی، بجلی اور دیگر تمام آفات سماوی اور ارضی پر مشتمل ہے اور اگرچہ اس لفظ کو عام ترین معنوں میں لیا گیا ہے لیکن پھر بھی اس کا عموم اپنے مضاف لفظ شر کے ساتھ مقید ہے اور اس لیے اس کا عموم مطلق نہیں، جس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہر ایک چیز میں شر پایا جاتا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایک شر سے پناہ مانگتا ہوں جو کسی مخلوق میں پایا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر عموم پہلے لفظ میں مطلق ہے، یعنی

ہر ایک قسم کا شر اور دوسرے میں مقید یعنی کوئی مخلوق جس میں شر پایا جاتا ہے ہر ایک مخلوق اس سے مراد نہیں، کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک مخلوق میں شر کا وجود ہو، چناں چہ جنت ایک مقام ہے جس میں مطلق شر کا وجود نہیں۔ اسی طرح ملائکہ اور انبیاء علیہم السلام کا وجود خیر محض ہے اور انہیں کی بدولت دنیا میں ہر ایک قسم کا خیر و برکت پھیلا ہے۔

الغرض مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ اپنی تعمیم کے لحاظ سے ہر ایک مخلوق کے شر کو جو دنیا اور آخرت میں پایا جاتا ہے، شامل ہے۔ اور شیاطین الانس والجن کا شر، درندوں اور پرندوں کا شر، جڑی بوٹی کا شر، آندھی اور طوفان کا شر، بجلی اور زلزلے کا شر، اور جملہ آفات و بلیات ارضی وسماوی کا شر اس کے مفہوم میں داخل ہے۔

استعاذۂ سفر:

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: جو شخص کسی مقام پر اتر کر یہ الفاظ کہے:

((اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ))[1]

''میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کی پناہ ڈھونڈ کر ہر ایک مخلوق کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔''[2]

تو اس کو کوچ کرنے کے وقت تک کسی قسم کا ضرر نہیں پہنچے گا۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ جب سفر میں ہوتے تھے اور رات پڑ جاتی تھی تو یہ الفاظ فرماتے:

((یا ارض ربی وربك الله اعوذ بالله من شرك وشر ما فيك وشر ما خلق

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الدعوات، باب في التعوذ من سوء القضاء رقم: ٥٤، ٥٥/ ٢٧٠٨۔ سنن ابو داؤد، كتاب الطب، باب كيف الرقى، رقم: ٣٨٩٢

[2] یہ استعاذہ اہل جاہلیت کے اس استعاذہ کا کہ ''نعوذ بسيد هذا الوادي من شر سفهاء قومه'' کا موحدانہ جواب اور اس کا نعم البدل ہے۔ مترجم

فيك و شر ما يدب عليك اعوذ بالله من اسد اسود و من الحية و العقرب و من ساكن البلد و من شر و الد ماولد)) ❶

''اے زمین! تیرا اور میرا رب اللہ تعالیٰ ہے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں تیرے شر سے اور اس چیز کے شر سے جو تجھ میں ہے اور اس چیز کے شر سے جو تجھ میں پیدا کی گئی ہے اور اس چیز کے شر سے جو تیرے اوپر رینگتی ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں شیر اور اژدہا سے، سانپ اور بچھو سے، شہر کے باشندوں کے شر سے اور والد اور مولود کے شر سے۔''

ایک دوسری حدیث میں استعاذہ کے الفاظ اس طرح ہیں:

((اعوذ بكلمات الله التامات التي لايجاوزهن بر ولا فاجر من شر ماخلق و ذراء و براء و من شر ما نزل من السماء وما يعرج فيها و من شر ما ذراء في الارض و ما يخرج منها و من شر فتن الليل و النهار و من شر كل طارق الا طارقا يطرق بخير يارحمن.)) ❷

''میں اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں جس کے حکم کے دائرہ سے کوئی نیک اور بد باہر نہیں، ہر ایک قسم کے شر سے جو کسی مخلوق میں پایا جاتا ہے جس کو اس نے پیدا کیا اور اس چیز کے شر سے جو آسمان سے اترتی اور اس میں چڑھتی ہے اور اس چیز کے شر سے جس کو اس نے زمین میں پھیلا دیا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور دن اور رات کے فتنوں سے اور ہر ایک رات کے وقت آنے والے کے شر سے اس رات کے آنے والے کے جو خیر لے کر آتا ہے، اے میرے مہربان خدا!۔''

---

❶ سنن ابو داؤد، كتاب الجهاد، باب مايقول الرجل اذا نزل المنزل، رقم: ٢٦٠٣ ـ مسند احمد(١٣٢/٢) رقم: ٦١٦١

❷ مؤطا امام مالك، كتاب الشعر، باب مايؤمر به من التعوذ

فصل دوم

شر کی دوسری قسم

استعاذہ من شر غاسق: اس سورۃ کی دوسری آیت:

﴿مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ.﴾

''اور میں پناہ مانگتا ہوں شب تاریک کے شر سے، جب کہ وہ چھا جاتی ہے۔''

تخصیص بعد تعمیم ہے۔

غاسق کے معانی:

اکثر مفسرین کا قول ہے کہ غاسق کے معنی شب تاریک ہے اور بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کا اشتقاق غسق ؑ سے ہے جس کے معنی ہیں رات کی تاریکی، جیسے کہ اس آیت میں ہے:

﴿اَقِمِ الصَّلَاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ.﴾(بنی اسرائیل:۱۷/۷۸)

''نماز کو قائم رکھ سورج کے ڈھلنے کے وقت سے رات کی تاریکی تک۔''

حسن، مجاہد اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہم نے بھی اپنی اپنی عبارتوں میں لفظ مذکور کی تقریباً یہی تشریح کی ہے، لیکن بعض کے نزدیک غسق کے معنی ٹھنڈک اور خنکی کے ہیں اور چونکہ رات کو عموماً خنکی ہوتی ہے اس لیے اس کو غاسق کہتے ہیں۔

اس کا شاہد غساق کا لفظ ہے جو بقول ابن عباس ومجاہد ومقاتل رحمۃ اللہ علیہم زمہریر کو کہتے ہیں، لیکن ان دونوں اقوال میں کوئی منافات نہیں کیونکہ رات کے وقت تاریکی اور خنکی دونوں پائی جاتی ہیں اور دونوں اقوال کے بموجب وجہ تسمیہ مختلف ہونے کے باوجود مسمّیٰ ایک ہے، یعنی یہ کہ غاسق سے مراد رات ہے لیکن آیت کے مناسب تاریکی کے معنی ہیں کیونکہ اکثر فسادات رات میں تاریکی کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں نہ کہ اس کی خنکی کی وجہ سے۔

اس لیے استعاذہ کے مناسب حال غاسق کے معنی شب تاریک کے ہیں نیز مستعاذ بہ کو رب الفلق (روشنی صبح کا مالک خدا) کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس لحاظ سے بھی غاسق کے

معنی شب تاریک ہوتو اس سے مستعاذ بہ اور مستعاذ منہ میں کامل مناسبت پیدا ہو جاتی ہے۔

غاسق سے مراد چاند:

آنحضرت ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ پکڑ کر انہیں چاند کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا: ''اس کے شر سے پناہ مانگو، کیونکہ یہی غاسق ہے۔''❶

کہا جاتا ہے چوں کہ یہ مرفوع روایت ہے اس لیے تمام دوسرے اقوال پر اس کو ترجیح دینا لازم ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تفسیر بے شک درست ہے، لیکن یہ پہلی تفسیر کے مخالف نہیں بلکہ اس کے موافق اور اس کی مؤید ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَا اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَا اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً ﴾ (بنی اسرائیل:۱۷/ ۱۲)

''ہم نے دن اور رات کو اپنی قدرت کی دو نشانیاں بنایا۔ پھر رات کی نشانی کو ہم نے مٹا دیا اور دن کی نشانی کو ہم نے روشن بنا دیا۔''

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ چاند رات کی نشانی ہے، اس لیے رات اور چاند کے مفہوم میں تلازم ہے (دونوں کا مفہوم آپس میں لازم وملزوم ہے) اس لیے دونوں پر غاسق کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا کسی ایک معنی کی تخصیص کرنا اس بات سے مانع نہیں کہ دوسرے معنی بھی مراد ہوں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ سے کسی صحابی نے یہ دریافت کیا:

﴿ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى. ﴾ (التوبہ:۹/ ۱۰۸)

''وہ مسجد جس کی بنیاد تقوی پر رکھی گئی۔''

(جس کا ذکر سورۂ توبہ میں ہے) سے کون سی مسجد مراد ہے، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

---

❶ سنن ترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سور، المعوذتین، رقم: ۳۳۶۶۔ مسند احمد (۶/ ۲۱۵) رقم: ۲۶۳۲۲۔ مستدرک حاکم (۲/ ۵۴۰، ۵۴۱)

"یہ میری مسجد ہے۔"❶ اب اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آیت کریمہ میں اس سے مسجد قبا مراد نہ ہو بلکہ

﴿ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى ﴾

اپنے عمومیت مفہوم کے لحاظ سے دونوں مسجدوں کو شامل ہے۔

جیسے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت فاطمہ اور حسنین رضی اللہ عنہم کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: "بار خدایا! یہ میرے اہل بیت ہیں۔"❷ اب اس کے یہ معنی نہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ازواج اس کے مفہوم سے خارج ہیں، بلکہ دراصل آیت کا نزول ازواج مطہرات ہی کے لیے تھا جیسے کہ سیاق سے واضح ہے۔

اس کی توضیح ایک اور مثال سے ہو سکتی ہے۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

((ليس الشديد بالصرعة انما الشديد الذى يملك نفسه عند الغضب.))❸

"پہلوان وہ شخص نہیں جو لوگوں کو پچھاڑتا پھرے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ کو ضبط میں رکھے۔"

اس کے یہ معنی نہیں کہ جو شخص دوسروں کو پچھاڑتا ہے وہ پہلوان ہی نہیں، بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ جو شخص غصہ کے وقت اپنے آپ کو ضبط میں رکھ سکتا ہے وہ بطریق اولیٰ پہلوان ہے۔

اسی طرح آنحضرت ﷺ کا چاند کی طرف اشارہ کرکے یہ فرمانا کہ هذا هو الغاسق یہ معنی نہیں رکھتا کہ شب تاریک غاسق کا مفہوم نہیں بلکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ چاند بھی غاسق کے مفہوم میں داخل ہے۔

---

❶ سنن ترمذی، کتاب مواقیت الصلاة، باب ماجاء فی المسجدالذی اسس علی التقوی، رقم:٣٢٣

❷ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی ابن ابی طالب، رقم:٣٢۔ سنن ترمذی، رقم:٣٢٠٥۔ تفسیر ابن جریر (٧/٢٢) مستدرك حاکم (٤١٦/٢)

❸ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل من یملك نفسه عندالغضب، رقم: ٢٦٠٩/١٠٧

اذا وقب کے معنی:

یہ قول ضعیف ہے کہ غاسق سے مراد چاند بحالت خسوف ہے اور اذا وقب کے یہ معنی ہیں کہ جب اس کو گرہن لگ جائے۔ یہ سلف میں سے کسی کا قول نہیں۔

ترمذی کی حدیث میں اس بات کا کچھ ذکر نہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے چاند کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ھذا ھو الغاسق تو اس وقت وہ خسوف زدہ تھا۔ لیکن اگر وہ خسوف زدہ ہوتا تو راوی پر لازم تھا کہ وہ اس حالت کی تصریح کرتا۔ علاوہ ازیں لغت سے اس کی تائید بھی نہیں ہوتی، کیونکہ وقوب کہیں بھی خسوف کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ وقوب کے معنی دخول کے ہیں:

﴿ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ﴾ یعنی (من شر اللیل اذا دخل.)

بعض مفسرین کا قول ہے کہ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے معنی ہیں ثریا کے ستارے جب کہ وہ غروب ہونے لگیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ثریا (پروین) یا خوشۂ آسمان کا جب طلوع ہوتا ہے تو بیماریاں اور آفتیں کم ہو جاتی ہیں لیکن اس کے غروب ہونے کے زمانہ میں بیماریوں اور آفتوں کا نزول ہوتا ہے۔ اگر ان لوگوں کی مراد اس قول سے یہ ہے کہ غاسق کا لفظ عموم کے لحاظ سے پروین کی اس حالت خاص کو بھی شامل ہے تب تو اس میں کچھ حرج نہیں، اور ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن اگر ان کا خیال یہ ہے کہ غاسق کا مفہوم انہی کے بیان کردہ معنوں تک محدود ہے تو یہ قطعاً باطل ہے۔

فصل سوم

رات اور چاند سے استعاذہ کی حقیقت

رات کی تاریکی:

شب تاریک اور چاند کے شر سے استعاذہ کا حکم اس لیے ہوا ہے کہ رات کے آغاز پر شریر اور خبیث روحیں پھیل جاتی ہیں اور شیطان جا بجا پھرنے لگتے ہیں، چنانچہ ایک صحیح حدیث

میں ہے:

''سورج کے غروب ہونے تک جا بجا شیطان پھرنے لگتے ہیں۔''❶

اسی لیے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

''غروب کے بعد اپنے بچوں کو باہر نہ جانے دو اور چوپایوں کو گھر میں باندھ رکھو، جب تک کہ عشاء ٹل نہ جائے۔''❷

ایک اور حدیث میں ہے:

''اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ کے موافق اپنی مخلوق کو پھیلاتا ہے۔''❸

رات کی تاریکی کا وقت ہے اور اس میں شیاطین الانس والجن کو وہ غلبہ حاصل ہو سکتا ہے جو دن کے وقت سورج کی روشنی میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ دن، روشنی کا وقت ہے اور شیطان کو اس سے نفرت ہے۔ وہ تاریکی کو زیادہ پسند کرتا ہے اور سیاہ کار تاریک عمل لوگوں پر اس کو تسلط حاصل ہوتا ہے۔

دن کی روشنی:

کہتے ہیں کہ مسیلمہ کذاب (مدعی نبوت) سے کسی نے دریافت کیا کہ تم پر کس طرح اور کن اوقات میں القاء ہوتا ہے؟ اس نے جواب میں کہا کہ جب گھپ اندھیرا ہوتا ہے تو مجھ پر القا ہوتا ہے۔ پھر اس نے آنحضرت ﷺ سے اس بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا، دن کی روشنی میں مجھ پر وحی آتی ہے۔ اس سے پوچھنے والے نے آنحضرت ﷺ کی سچائی اور اول الذکر کے جھوٹا ہونے پر استدلال کیا۔

---

❶ صحيح بخاری، كتاب بدء الخلق، باب صفة ابليس، رقم: ٣٢٨٠۔ صحيح مسلم، كتاب الاشربة، باب استحباب تخمير الاناء، رقم: ٢٠١٢/٩٧

❷ صحيح بخاری، كتاب بدء الخلق، باب صفة ابليس، رقم: ٣٢٨٠۔ صحيح مسلم، كتاب الاشربة، باب استحباب تخمير الاناء، رقم: ٢٠١٣/٩٨

❸ مسند احمد (٣٠٦/٣) رقم: ١٤٣٣٤

اسی طرح جادو کا اثر بھی رات کو زیادہ ہوتا ہے۔ اور جادو کے جو اعمال رات کے وقت عمل میں لائے جاتے ہیں، عام طور پر مشہور ہے کہ ان کا اثر قوی تر ہوتا ہے اور جس طرح تاریک گھر اور تاریک جگہیں شیطان کا مسکن اور اس کی جولان گاہ بنی رہتی ہیں اسی طرح جو دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے منور نہیں ہوئے وہ بھی شیطان کے اثر کو زیادہ قبول کرتے ہیں اور وہ ان کے اندر آسانی سے گھس جاتا ہے۔

فصل چہارم

استعاذہ برب الفلق کے اسرار

نور اور ظلمت:

اس سے تم کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ رب الفلق (صبح کا مالک خدا) کا لفظ یہاں پر استعمال کرنا کہاں تک موزوں اور مناسب ہے۔ صبح کی روشنی سے نور کی بادشاہت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے ظہور پر تاریکی کا لشکر شکست کھا جاتا ہے اور رات کی تاریکی میں شرور پھیلانے والوں کی جمعیت تتر بتر ہو جاتی ہے۔ ایک خبیث الطبع شریر، تمام چور اور رہزن، مفسدہ پرداز جن اور شیطان کسی نہ کسی جگہ چھپ جاتے ہیں اور زہر دار خزندے اپنے بلوں میں گھس کر نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مامور فرمایا ہے کہ روشنی کے مالک خدا کے ساتھ پناہ مانگیں جو ظلمت کی شکست کا موجب ہے۔

تقابل ایمان وکفر:

اللہ تعالیٰ نے جابجا اپنے کلام پاک میں اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور کافروں کو تاریکی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیتا ہے۔

﴿ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ

كَفَرُوا اَوْلِيٰئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ.﴾

(البقرة:۲/۲۵۷)

''اللہ تعالیٰ مؤمنوں کا دوست ہے ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے لیکن کافروں کے دوست شیطان ہیں جو ان کو روشنی سے نکال کر تاریکی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا.﴾ (الانعام:۶/۱۲۲)

''کیا وہ شخص جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کے لیے روشنی بنائی جو تاریکیوں میں اس کے لیے مشعل راہ کا کام دیتی ہے۔ اس شخص کے برابر ہے جو تاریکیوں میں مبتلا ہے جس سے نکلنے کی راہ اس کو نہیں سوجھتی۔

اسی طرح کافروں کے لیے مثال بیان فرمائی ہے:

﴿اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ.﴾ (النور:۲۴/۴۰)

''ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی سمندر کی لہروں میں تاریکیوں کے اندر محصور ہو تہ بہ تہ لہروں کے اوپر بادلوں کی بھی ایک تہ ہو جس سے اندھیرے کی بھی تہیں بن گئی ہوں۔ اپنا ہاتھ نکالنے پر اس کو وہ ہاتھ تک دکھائی نہیں دیتا اور جس کو اللہ تعالیٰ نے نور نہیں دیا وہ نور سے بالکلیہ محروم رہے گا۔''

اس آیت سے پہلے کی آیت میں مؤمنوں کی مثال حسب ذیل بیان فرمائی ہے:

﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ

اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّ لَا غَرْبِیَّۃٍ لا یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ط نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ط یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ.﴾ (النور:٢٤/٣٥)

”اس کے نور کی مثال ایک طاقچے کی ہے جس میں ایک چراغ دھرا ہو، وہ چراغ ایک شیشے کے اندر ہے جو ایک ستارہ درخشاں کی طرح مجلّٰی ہے، وہ چراغ ایک درخت سے (زیتون کی عمدہ ترین قسم کے تیل سے) جلایا جاتا ہے جو قریب ہے کہ آگ کے ساتھ چھو جانے سے بھی پیشتر بھڑک اٹھے، اوپر تلے روشنی ہی روشنی ہے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی طرف ہدایت فرماتا ہے۔“

الغرض ایمان ایک نور ہے جس کا مآل نور کی طرف ہے۔ اس کا مستقر مومن کا دل ہے جو چراغ کی طرح روشن ہے اور ایمان والوں کا ربط ضبط، ارواح طیبہ اور ملائکہ علیہم السلام کے نورانی وجود کے ساتھ رہتا ہے۔ برخلاف اس کے کفر اور شرک ایک تاریکی ہے جس کا مآل تاریکی کی طرف ہے اور اس کی کارگاہ کافروں کے پرظلمت دل ہیں اور اہل کفر کا میل جول ارواح خبیثہ اور شیاطین کی تاریک مستیوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے سورۃ الفلق میں روشنی صبح کے مالک خدا کے ساتھ شب تاریک کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے (فتامل)

اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق رسالت کی ایک بین دلیل ہے اور وہ شیاطین کے آوردہ کلام کے عین متضاد ہے۔

﴿وَمَاتَنَزَّلَتْ بِہِ الشَّیٰطِیْنُ وَمَا یَنْبَغِیْ لَھُمْ وَمَا یَسْتَطِیْعُوْنَ.﴾

(الشعراء:٢٦/٢١٠۔٢١١)

”اس کلام پاک کو شیاطین نے نہیں اتارا اور نہ ہی ایسے پاکیزہ کلام کا اتارنا ان کے حسب حال اور نہ ان کے لیے ممکن ہے۔“

فصل پنجم

تفسیر الفلق

فلق بمعنی پھوٹنا:

لفظ فلق روشنی صبح کا مادہ پھوٹنے پر یا اگر متعدی فعل ہو تو چیرنے پھاڑنے پر دلالت کرتا ہے یہ صفت کم وبیش تمام مخلوقات میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ صبح کی پَو پھوٹنا، اناج کے دانوں اور گٹھلیوں کا پھوٹنا اور اس کے انواع واقسام نباتات کا پھوٹ کر نکلنا، پہاڑوں سے چشموں کا پھوٹنا، زمین کا پھوٹنا، بادلوں کا پھوٹ پڑنا اور ان سے بارش کا نازل ہونا، رحم مادہ کا پھوٹنا اور اس سے بچہ کا پیدا ہونا وغیرہ وغیرہ۔

فلق بمعنی لزوم علیحدگی:

پھوٹنے کے ساتھ دونوں چیزوں میں فرق ہونا اور علیحدگی نمودار ہونا لازم ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ جسمانی اشیاء میں یہ صفت پائی جاتی ہے اسی طرح اللہ جل شانہٗ حق اور باطل کو بھی جدا کرتا اور ان میں علیحدگی پیدا کرتا ہے اور اسی لیے اس نے اپنی کتاب مقدس کا نام فرقان رکھا ہے یعنی حق اور باطل میں جدائی کرنے والی کتاب۔ علیٰ ہذا جب اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کی حمایت فرماتا اور ان کے دشمنوں پر عذاب اور ہلاکت نازل فرماتا ہے جس سے دین حق اور باطل میں علیحدگی نمودار ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے اس فعل کو بھی فرقان کہا جاتا ہے۔

﴿وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ.﴾ (البقرۃ:۲/۵۳)

”جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ایک کتاب دی اور اس کے دین حق کا بول بالا کرنے کے لیے اس کو فرقان دیا۔“ (اس کے دوستوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ ایک فریق کو نجات دی اور دوسرے فریق کو غرق کر دیا)

اس سے بھی تم کو رب الفلق اور من شر غاسق اذا وقب کے درمیان معنوی مناسبت واضح ہوگی۔ (فتامل)

فصل ششم

شر کی تیسری قسم

استعاذہ من شر النفثت:

﴿ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ. ﴾

''اور گانٹھوں پر پھونکنے والی جماعتوں کے شر سے میں پناہ مانگتا ہوں۔''

اس آیت میں شر کی تیسری قسم کا ذکر ہے۔ گانٹھوں پر پھونکنے والی جماعتوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو کسی دھاگے میں گرہیں لگا کر ہر ایک گرہ پر جادو کرنے کی غرض سے کچھ منتر جنتر پھونکتے ہیں۔ چوں کہ ساحر (جادوگر) کا نفس کیفیت خبیثہ کے ساتھ آمادہ ہوتا ہے اور مناسبت کی وجہ سے شیاطین کے نفوس خبیثہ اس کی اعانت کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ قانون قدرت کی مقررہ دفعات (جس کی حقیقت اور تفصیل کا علم صرف خدائے عالم الغیب کو ہے) کے بہ موجب اس کا اثر مسحور پر ہوتا ہے النَّفّٰثٰت کا لفظ جمع مؤنث ہے اور اس لیے یہاں پر ایک سوال وارد ہوتا ہے:

سوال: سحر کا عمل تو مذکر اور مؤنث دونوں سے صادر ہوتا ہے، پھر مؤنث کی تخصیص کیا معنی رکھتی ہے؟

جواب: اس کا جواب ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے کہ اس صیغہ کا استعمال تخصیص کے لیے نہیں بلکہ ایک امر واقع کیا بنا پر ہے۔ کیونکہ لبید بن اعصم یہودی کی بیٹیوں نے آنحضرت ﷺ پر سحر کا عمل کیا تھا اور اس کا اثر زائل کرنے کے لیے یہ دونوں سورتیں پہلے نازل ہوئی تھیں۔ لیکن یہ جواب چنداں تحقیق پر مبنی نہیں کیونکہ صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ سحر کرنے والا خود لبید بن اعصم تھا۔ اس لیے حقیقی جواب یہ ہے کہ چونکہ سحر کے مؤثر ہونے میں نفوس اور ارواح خبیثہ کا بڑا دخل ہے، اور یہ دونوں لفظ کلام عرب میں مؤنث استعمال ہوتے ہیں، اس لیے النَّفّٰثٰت مؤنث کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

واقعہ سحرالنبی ﷺ:

حضرت عائشہ ؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ پر جادو کیا گیا اور اس کا یہاں تک اثر ہوا کہ بعض اوقات آپ کو خیال پیدا ہوتا تھا کہ میں نے فلاں کام کرلیا ہے لیکن حقیقت میں نہیں کیا ہوتا تھا۔ جب یہ حالت پیدا ہوئی تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی اور پھر مجھ سے (حضرت عائشہ ؓ سے) اس طرح مخاطب ہوئے۔ کیا تم کو معلوم ہے کہ جس بات کے لیے میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی اس بارے میں مجھ کو قطعی علم عنایت ہوا ہے؟ حضرت عائشہ ؓ نے عرض کی، اللہ کے رسول یہ کیسے؟

آپ نے فرمایا میرے پاس (خواب یا مکاشفہ کی حالت میں) دو آدمی آئے، ایک اُن میں سے میرے سرہانے بیٹھ گیا اور دوسرا پاؤں کے پاس، جس کے بعد ایک نے دوسرے سے کہا، اس شخص کو کیا بیماری ہے؟ دوسرے نے کہا، اس پر جادو کیا گیا ہے۔ پہلے نے پھر کہا، کس نے اس پر جادو کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ لبید بن اعصم نے۔ پہلے نے دریافت کیا، کس چیز کے ذریعہ سے؟ اس نے کہا کہ کنگھی کے گرائے ہوئے بالوں اور نر کھجور کے گابھے کے غلاف کے ذریعے سے، پہلے نے سوال کیا کہ وہ جادو کہاں ہے؟ اس نے کہا، ذراوان کے کنویں میں جو بنی زریق کے قبیلہ میں ہے۔

اس واقعہ کے دکھائی دینے کے بعد آپ اس کنویں پر تشریف لے گئے اور واپس آکر حضرت عائشہ ؓ کے سامنے اس طرح بیان فرمایا کہ اس کا پانی اس قدر سرخ تھا گویا اس میں مہندی کے پتے بھگوئے گئے ہیں اور اس کے اردگرد کھجور کے درخت شیطانوں کے سر معلوم ہوتے تھے (بدصورت اور بدنما ہونے کی وجہ سے) حضرت عائشہ ؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! تو آپ نے اس کو نکالا نہیں؟ آپ نے فرمایا، مجھ کو اللہ تعالیٰ نے شفا بخشی تو میں نے مناسب خیال نہیں کیا کہ لوگوں میں فتنہ وفساد پیدا کروں، اس کے بعد اس کنویں کو بند کیا گیا۔ [1]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الطب، باب السحر، رقم:٥٧٦٣، ٥٨٦٣

ھل یستخرج السحر:

صحیح بخاری کی ایک دوسری روایت سے بظاہر اس کا نکالنا ثابت ہوتا ہے۔ اس دوسری روایت کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا اور اس کا یہاں تک اثر ہوا کہ بعض اوقات آپ خیال کرتے تھے کہ ہم بستر ہوئے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ سفیان جو اس حدیث کا راوی ہے اس کا قول ہے کہ یہ سحر کی شدید ترین قسم ہے۔

ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ کیا تم کو معلوم ہے کہ جس بات کے لیے میں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی اس کے بارے میں مجھ کو قطعی علم بخش دیا ہے۔ دو آدمی میرے پاس آئے، ایک میرے سرہانے اور دوسرا میری پائنتی بیٹھ گیا۔ جو میرے سرہانے تھا اس نے دوسرے سے کہا، اس شخص کو کیا ہوا ہے؟ اس نے کہا اس پر جادو کیا گیا ہے۔ پہلے نے کہا، کس نے اس پر جادو کیا ہے؟ دوسرے نے کہا، لبید بن اعصم نے۔ یہ بنی زریق کا ایک شخص تھا جو یہودیوں کا حلیف تھا اور منافق تھا۔ پھر پہلے نے کہا اس نے کس چیز کے ذریعہ سے جادو کیا ہے؟ اس نے کہا، نر کھجور کے گابھے کے غلاف میں جو ذروان کے کنویں میں ایک چکی کے پاٹ کے نیچے رکھا ہوا ہے۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کنویں پر تشریف لے گئے اور اس کو باہر نکال لیا۔ آپ نے فرمایا یہ وہ کنواں ہے جو مجھ کو (خواب یا مکاشفہ کی حالت میں) دکھایا گیا۔ اس کا پانی مہندی کے خیساندہ کی طرح سرخ تھا اور اس کے ارد گرد کھجوروں کے درخت شیطانوں کے سر معلوم ہوتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ پھر اس کو کھولا کیوں نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے شفا بخش دی ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ لوگوں میں فتنہ وفساد پیدا کروں۔ [1]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الطب، باب السحر، رقم: ۵۷۶۵، ۵۸۶۵، ص: ۱۰۱۸

اس حدیث کا امام بخاری نے عنوان بھی یہ قائم کیا ہے کہ "ھل یستخرج السحر" "کیا جادو نکالا جائے"؟ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے پوچھا: ایک شخص پر جادو کیا گیا ہے اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستر ہونے سے روکا گیا ہے، کیا اس جادو کو کھولا جائے؟ اس نے جواب دیا، کچھ حرج نہیں اس کی غرض تو اصلاح ہے اور ایسی باتوں سے شریعت نے منع نہیں فرمایا جس میں لوگوں کا فائدہ ہو۔"

تناقض روایات:

الغرض مندرجہ بالا دونوں روایتوں میں تناقض معلوم ہوتا ہے، ایک سے نکالنا اور دوسری سے نہ نکالنا ثابت ہوتا ہے لیکن درحقیقت ان میں کچھ تعارض نہیں۔ نکالنے سے یہ مراد ہے کہ آپ نے خود اس کو نکال کر دیکھا اور پھر دفن کر دیا۔ لیکن نہ نکالنے سے مراد یہ ہے کہ نکال کر منظر عام پر اس کو نہیں لائے اور لوگوں کو نہیں دکھایا جس کا مانع بھی آپ نے بیان فرمایا اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ ایسا کرتے تو مسلمانوں میں ایک جوش پیدا ہو جاتا اور ان کا خاموش رہنا ممکن نہ تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ساحر کی قوم بھی اس کی حمایت کے لیے کھڑی ہو جاتی اور فریقین میں فتنہ وفساد کی آگ مشتعل ہو کر اس کی چنگاریاں دور دور تک پھیل جاتیں اور پھر اس کا فرو کرنا دشوار ہو جاتا۔

چوں کہ مقصود حاصل ہو چکا تھا اور آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے شفا بخش دی تھی اس لیے جادو کو نکال کر منظر عام پر لانا اور خواہ مخواہ لوگوں کے جذبات کو تحریک دینا آنحضرت ﷺ نے مناسب خیال نہیں فرمایا جو آپ کے کریم النفس ہونے کی ایک روشن دلیل ہے۔

متکلمین کا قول:

یہ حدیث اہل علم کے نزدیک ثابت ہے اور سب نے اس کو مقبول قرار دیا ہے، کس کو بھی اس کی صحت میں اختلاف نہیں لیکن اکثر اہل کلام نے اس حدیث کی صحت سے انکار کیا ہے اور اس کی تکذیب کی ہے۔ چنانچہ بعض متکلمین نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور جو دلائل انہوں نے اس حدیث کے رد میں لکھے ہیں ان کا ملخص یہ ہے کہ اس حدیث کے راوی کو غلطی ہوئی ہے اور حقیقت میں کوئی اس قسم کا واقعہ پیش نہیں آیا۔ آنحضرت ﷺ کی شان

سے یہ بعید ہے کہ آپ پر سحر کا اثر ہو، کیوں کہ اگر ہم مان لیں کہ آپ پر جادو کا اثر ہوا تھا تو اس سے کافروں کے قول کی تصدیق ہو جائے گی جو آنحضرت ﷺ کو مسحور کہا کرتے تھے۔ بلکہ انبیائے سابقین علیہم السلام کے حق میں بھی کافر لوگ ایسی ہی بکواس کیا کرتے تھے۔ چنانچہ فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا:

﴿ اِنِّیْ لَاَظُنُّکَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا. ﴾ (بنی اسرائیل:۱۷/۱۰۱)

''اے موسیٰ میرا تو خیال ہے کہ تم پر کسی نے جادو کیا ہے۔''

صالح اور شعیب علیہما السلام کی قوم نے ان کو انہی لفظوں سے مخاطب کیا تھا۔

﴿ اِنَّمَا اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ. ﴾ (الشعراء:۲۶: ۱۵۳)

''بے شک تم ان میں سے ہو جن پر جادو کیا گیا ہو۔''

لیکن یہ کفار کا قول ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انبیائے علیہم السلام کے سحر کے اثر سے محفوظ رہنا لازم ہے، کیوں کہ اگر ہم اس کو جائز تصور کریں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ شیطان کے اثر میں آسکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں حمایت اور عصمت کا جو وعدہ فرمایا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو پورا نہیں کیا۔ وغیرہ وغیرہ!!

اہل علم کی رائے:

متکلمین کے یہ دلائل علمائے حدیث کے نزدیک کچھ وزن نہیں رکھتے کیونکہ ہشام جو اس حدیث کا راوی ہے نہایت ثقہ اور بہت بڑا عالم ہے اور ائمہ حدیث میں سے کسی نے بھی اس کی روایت کو قابل اعتراض خیال نہیں کیا۔ اس لیے متکلمین کی جرح قدح سے وہ مطعون قرار نہیں دیا جا سکتا۔ علاوہ ازیں ہشام سے قطع نظر کر کے دوسرے متعدد راویوں نے اس حدیث کو روایت کیا ہے اور امام بخاری اور امام مسلم کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور اہل حدیث میں سے کسی نے بھی ان کے اس فیصلہ پر نکتہ چینی نہیں کی۔

مفسرین، اہل حدیث فقہاء اور مؤرخین سب کے نزدیک یہ ایک مشہور اور تسلیم شدہ واقعہ ہے۔ اور متکلمین کی نسبت یہ لوگ آنحضرت ﷺ کی سیرت (حالات زندگی) کو زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔

ابوبکر بن ابی شیبہ نے زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک یہودی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا۔ جس کے اثر سے کئی روز تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شکایت رہی۔ اس کے بعد جبریل علیہ السلام آپ کے پاس تشریف لائے اور کہا کہ ایک یہودی نے آپ پر جادو کیا ہے اور گرہیں لگائی ہیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمی بھیج کر وہ گرہیں (کنویں سے) نکلوالیں اور ان کو کھولنا شروع کیا۔ جب بھی آپ کوئی گرہ کھولتے تھے اس سے آپ کو تخفیف محسوس ہوتی تھی، یہاں تک کہ جب تمام گرہیں کھول دیں تو آپ کی طبیعت بالکل ہلکی پھلکی ہوگئی۔ آپ نے یہودی سے اس کا ذکر تک نہیں کیا اور نہ کبھی آپ کے چہرۂ مبارک پر اس کی علامت دیکھی گئی۔ ❶

ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ایک یہودی غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا، یہودیوں نے اسے بہکانا شروع کیا اور اس کو مجبور کیا کہ وہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کنگھی سے گرے ہوئے بال اور آپ کی کنگھی کے چند ایک دندانے دے، چنانچہ یہودیوں نے ان دونوں چیزوں کے ذریعہ آپ پر جادو کیا۔ اور اس کام کو لبید بن اعصم نے انجام دیا۔ ❷

سورۂ فلق اور سورۂ ناس اس بارے میں نازل ہوئیں۔ ان سورتوں کی گیارہ آیتیں ہیں۔ سورۂ فلق کی پانچ اور سورۂ ناس کی چھ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پڑھنا شروع کیا، تو ہر ایک آیت کے ختم ہونے پر ایک گرہ کھل جاتی تھی، یہاں تک کہ تمام گرہیں کھل گئیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیماری کے اثر سے بالکل آزاد ہوگئے۔

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھ مہینے تک اس کے اثر میں مبتلا رہے۔ تین دن تک اس کی شدت رہی اور بالآخر معوذتین نازل ہوئیں۔ ❸

---

❶ تفسیر بغوی(۹/۳۵۲،۳۵۳)تحت تفسیر سورۃ الفلق

❷ تفسیر درالمنثور(۸/۶۸۷)اسباب النزول للواحدی(۲۶۳)

❸ تفسیر بغوی(۹/۳۵۳)وتفسیر الخازن(۷/۲۶۷)تحت تفسیر سورۃ الفلق

جادو ایک عارضہ ہے:

متکلمین کے جواب میں اہلحدیث کہتے ہیں کہ جادو کا اثر بھی دوسری بیماریوں کی طرح ایک عارضہ ہے جس میں آنحضرت ﷺ کچھ مدت تک مبتلا رہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے نجات دی اور شفا بخشی۔ بیماری کا عارض ہونا انبیاء علیہم السلام کے لیے کوئی عیب کی بات نہیں (بلکہ ان کی بشریت کا اقتضاء ہے) یہاں تک کہ بعض حالات مرض میں ان پر بے ہوشی بھی طاری ہوسکتی ہے چنانچہ آنحضرت ﷺ پر مرض الموت میں چند مرتبہ بے ہوشی کا طاری ہونا صحیح روایت سے ثابت ہے۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ بالاخانے سے گرے تو آپ کا قدم اکھڑ گیا۔ [1] (آنحضرت ﷺ کے قدم کی ہڈی اتر گئی) اور ایک دفعہ گھوڑے سے گرنے کا اتفاق ہوا تو آپ کئی دن تک باہر نہیں نکل سکے کیوں کہ آپ کا پہلوئے مبارک چھل گیا تھا۔ [2] اس قسم کے عوارض کا پیش آنا کمال نبوت کے منافی نہیں، مرض اور مصیبت سے درجات میں زیادتی ہوتی ہے۔ [3]

ایک حدیث کا مضمون ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو سب سے زیادہ مصیبتیں پیش آتی ہیں۔ تم نے انبیاء علیہم السلام کے حالات میں پڑھا ہوگا کہ دین حق کی دعوت اور تبلیغ میں ان کو کیا کیا تکالیف برداشت کرنی پڑیں؟ اس لیے اس میں کون سی تعجب کی بات ہے۔ اگر آپ کو اپنے دشمنوں سے ان کے جادو کا عمل کرنے کی وجہ سے کسی قدر تکلیف سہنی پڑی ہو جیسے کہ یہ ایک امر ممکن بلکہ واقع ہے کہ اعدائے ملک نے آپ کو تیر و شمیر سے زخمی کیا اور ایک مرتبہ انہوں نے آنحضرت ﷺ کی پشت مبارک پر نماز کی حالت میں اوجھڑی رکھ دی تھی۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب قول النبی اذا رایتم الهلال فصوموا، رقم: ۱۹۱۱

[2] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب انما جعل الامام لیؤتم به، رقم: ۶۸۹۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب ائتمام المأموم بالامام، رقم: ۴۱۱/۷۷

[3] اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اگرچہ وہ اعلیٰ مراتب تک پہنچ چکے ہیں لیکن پھر بھی بشریت کے اوصاف سے وہ مبرا نہیں قل انما انا بشر مثلکم اور اس لیے ان کو خدا کا شریک مت ٹھہراؤ۔ مترجم

یہ تمام واقعات ابتلاء کی قسم سے ہیں اور وہ آنحضرت ﷺ کے لیے ہرگز کسر شان اور عیب وتنقیص کے موجب نہیں، یہ علو درجات کا باعث ہیں۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا اے محمد! کیا تمہیں بیماری کی شکایت ہے؟ آنحضرت ﷺ نے اثبات میں جواب دیا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا:

((بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ اَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ اَللّٰهُ يَشْفِيْكَ بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ.)) [1]

''میں اللہ تعالیٰ کے نام سے تمہارے لیے دم کرتا ہوں ہر ایک ایسی چیز سے جو تم کو تکلیف دے، ہر ایک نفس کے شر سے اور حاسد کی آنکھ سے اللہ تعالیٰ ہی تم کو شفا عنایت کرے گا، اللہ تعالیٰ ہی کے نام سے میں تمہارے لیے منتر کرتا ہوں۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شکایت کسی نفس شریر یا حاسد کے شر سے تھی جس کے زائل کرنے کے لیے جبریل علیہ السلام نے مندرجہ بالا الفاظ میں آپ پر دم پڑھا۔

منکرین سحر کا رد:

متکلمین کا یہ استدلال کہ کافر لوگ آنحضرت ﷺ کو مسحور کہتے تھے، اسی طرح فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو مسحور کے لفظ سے اور صالح اور شعیب علیہما السلام کو ان کی قوم نے مسحور کے لفظ سے مخاطب کیا۔ الیٰ آخر ما قال

اس کا جواب بعض اہلحدیث نے یہ دیا ہے کہ مسحور کا اشتقاق سحر بمعنی پھیپھڑے سے ہے۔ مسحور کے معنی پھیپھڑے والا یعنی انسان۔

---

[1] صحيح مسلم، كتاب السلام، باب الطب والمرضى والرقى، رقم: ٤٠/٢١٨٦ ـ سنن ترمذى، كتاب الجنائز، باب ماجاء في التعوذ للمريض، رقم: ٩٧٢ ـ سنن ابن ماجه، كتاب الطب، باب ما عوذ به النبى وما عوذ به، رقم: ٣٥٢٣

اس سے کافروں کی مراد یہ تھی کہ پیغمبر بھی ہماری طرح انسان ہے لیکن یہ جواب بہت ہی ناپسندیدہ اور دور از صواب ہے، کیوں کہ بشر کو مسحور کے لفظ سے تعبیر کرنا لغت کے کسی استعمال سے ثابت نہیں اور کلام مجید کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کافروں کو یہ کہنا منظور ہوتا تھا کہ تم بھی ہماری طرح انسان ہو، وہاں صریح بشر کا لفظ استعمال کرتے تھے:

﴿ قَالُوْا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (ابراهیم:١٤/١٠)

﴿ اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴾ (بنی اسرائیل:١٧/٩٤)

سحر و مسحور کی تحقیق:

علاوہ ازیں اگر مسحور کے معنی پھیپھڑے رکھنے والا ہوتا تو فرعون کا یہ کہنا:

﴿ اِنِّیْ لَاَظُنُّکَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا. ﴾ (بنی اسرائیل:١٧/١٠١)

نہایت ہی بیہودہ معلوم ہوتا ہے کیا اس کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ موسیٰ علیہ السلام ایک پھیپھڑے رکھنے والا انسان ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا یہ جواب دینا:

﴿ اِنِّیْ لَاَظُنُّکَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا. ﴾ (بنی اسرائیل:١٧/١٠٢)

''اے فرعون! میں تم کو ہلاک ہوتا ہوا خیال کرتا ہوں۔''

ناموزوں ہوگا بلکہ اگر مسحور سے مراد انسان تھا تو موسیٰ علیہ السلام کو یہ جواب دینا مناسب تھا کہ بے شک میں انسان ہوں لیکن بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے جیسے کہ سورۂ ابراہیم میں کافروں اور انبیاء علیہم السلام کا آپس کا خطاب اس طرح منقول ہے کہ جب کافروں نے انبیاء علیہم السلام سے یہ کہا کہ تم بھی ہم جیسے بشر ہو تو انبیاء علیہم السلام نے اس کے جواب میں یہ فرمایا:

﴿ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ یَمُنُّ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ﴾

(ابراهیم:١٤/١١)

''بے شک ہم تم جیسے انسان ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنی عنایت سے مخصوص فرماتا ہے۔''

الغرض بعض اہل حدیث کا یہ جواب نہایت ہی کمزور ہے۔بعض دوسرے اہل حدیث اورمفسرین نے جن میں سے ایک ابن جریر طبری ہیں یہ جواب دیا ہے کہ مسحور کے معنی ہیں وہ شخص جس کو جادو سکھلایا گیا ہو، گویا ساحر اور مسحور کے ان کے نزدیک ایک ہی معنی ہیں لیکن ساحر پر مسحور کا اطلاق لغت سے ثابت نہیں بلکہ مسحور اس شخص کو کہتے ہیں جس پر دوسرے نے جادو کیا ہو۔اور ساحر اس کو کہتے جو سحر کا علم جانتا ہو، جیسے کہ فرعون کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام کے حق میں کہا تھا:

﴿ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ.﴾ (الاعراف:۷/۱۰۹)

الغرض فرعون نے اس کو مسحور اور اس کی قوم نے اس کو ساحر کہا۔

سب سے بہتر ایک تیسرا جواب ہے جس کو علامہ زمخشری مصنف کشاف اور دوسرے مفسرین نے اختیار کیا ہے کہ مسحور کا لفظ قیاس لغوی کے مطابق اسم مفعول کے معنی رکھتا ہے لیکن اس کا مادہ سحر بمعنی جن (مجنون) ہوا۔ مسحور کے معنی بے سمجھ، دیوانہ جس کی عقل زائل ہو چکی ہو، جیسے کہ کافروں کا قول تھا:

﴿ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا.﴾ (بنی اسرائیل:۱۷/۴۷)

''جس کے معنی اس تفسیر کے مطابق یہ ہیں'' کہ تم تو دیوانے مسلوب العقل کے پیچھے جا رہے ہو۔''

حقیقت بھی یہی ہے کہ قابل اتباع وتقلید وہ شخص نہیں ہوتا جو عقل سے خالی ہے۔ جسمانی امراض اور تکالیف کسی ذی عقل وہوش کے نزدیک اتباع سے مانع نہیں۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے دشمنوں نے ان کو امراض اور جسمانی تکالیف کا کبھی طعنہ نہیں دیا اور نہ ہی ان کا ایسا کہنا دوسروں کے لیے اتباع سے مانع ہو سکتا تھا۔اس لیے کبھی تو وہ آپ کو شاعر، کبھی ساحر اور کبھی مجنون کہتے تھے۔قال اللہ تعالیٰ:

﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا.﴾

(بنی اسرائیل:۱۷/۴۸)

”دیکھو، یہ لوگ تمہارے لیے کیسی کیسی مثالیں بیان کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ گمراہ ہو گئے اور اپنی گمراہی میں اس قدر سرگرداں ہیں کہ ان کو راستہ نہیں ملتا۔“

راستہ نہ ملنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا مقصد آنحضرت ﷺ کے اتباع سے لوگوں کو روکنا ہے جس کے حصول کے لیے وہ آپ کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں لیکن ایک صاحب بصیرت انسان آپ کی سیرت اور آپ کے احوال کا بنظر امعان مطالعہ کر کے یقین کر لیتا ہے کہ جو کچھ یہ لوگ کہتے کہ وہ سراسر کذب اور بہتان ہے اور آنحضرت ﷺ ان کی ان افتراء پردازیوں سے بعید ترین انسان ہیں۔

متکلمین کے قول کا رد:

متکلمین کا یہ کہنا کہ اگر آنحضرت ﷺ پر جادو کا اثر ہوا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی حمایت اور حفاظت ناقص ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ رسولوں کی حمایت اور نصرت فرماتا ہے اسی طرح اپنی حکمت بالغہ سے بعض مصلحت ہائے خاصہ کے لیے ان کو بعض تکالیف میں مبتلا کرتا ہے جس سے ان کو عز وکرامت کے مراتب میں رفعت حاصل ہوتی ہے اور ان واقعات میں ان کے خلفاء اور افراد امت کے لیے درس عبرت ہوتا ہے۔ جب ان کو راہ حق میں کوئی مصیبت اور تکلیف پیش آتی ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی اس قسم کی تکلیفیں پیش آئی تھیں جن کو انہوں نے نہایت ثابت قدمی اور پامردی کے ساتھ برداشت کیا تو ان کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں اور وہ مشکلیں ان کے لیے آسان ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے افعال میں متعدد حکمتیں ہوتی ہیں جن کے ادراک سے اکثر اوقات انسان کی عقل قاصر رہتی ہے۔

﴿ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾

فصل ھفتم

جادوکا اثر مسلم ھے

قَالَ اللّٰهُ وَقَالَ الرَّسُوْلُ:

اللہ تعالیٰ کا یہ قول:

﴿ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ﴾

نیز وہ حدیثیں جن کا بیان گذشتہ فصل میں ہوا ہے، اس بات کی دلیل ہیں کہ جادو کی تاثیر حق ہے اور یہ حقیقت ہے، محض تخیل نہیں، لیکن معتزلہ اور بعض دوسرے اہل کلام اس کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جادو کے ذریعہ سے کسی کو بیمار یا قتل نہیں کیا جا سکتا اور نہ حقیقی طور پر کوئی دوسرا اثر از قسم حب وبغض اس کے ذریعہ پیدا کر سکتے ہیں۔ جادو کی حقیقت یہیں تک محدود ہے کہ اس کے ذریعہ قوت متخیلہ پر اثر ڈال سکتے ہیں اور اس میں حسب ارادہ تغیر پیدا کر سکتے ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سلف رحمہم اللہ علیہم کا مذہب:

لیکن ان کا یہ قول صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف کی متواتر روایات کے خلاف ہے۔ مفسرین و اہلحدیث، فقہاء واہل تصوف اور عام عقلاء کا قول بھی ان کے خلاف ہے۔ سحر کے ذریعہ سے کسی کو بیمار بنا دینا، اس کو ہلاک کرنا، اس کے ذریعہ سے حب وبغض پیدا کرنا اور اس کے علاوہ دوسرے اثرات کا ظہور میں آنا ایک حقیقت واقعیہ ہے جس کو عام لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے۔ اور بہت سے اشخاص کو اس کا وجدانی علم ہے کیونکہ ان پر جادو کا اثر ہوا ہے جس کو انہوں نے یقینی طور پر محسوس کیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قول:

﴿ وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ ﴾

اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ساحروں کا عمل غائبانہ بھی مضر اثر ڈالنے کا باعث ہوتا ہے اور اگر منکرین کے قول کے مطابق اس کا اثر اس حد تک محدود ہوتا کہ جب مسحور حاضر ہو تو اس صورت میں نَفّٰثٰت کے لیے کوئی شر نہ ہوتا جس کے پناہ مانگنے کی ضرورت پیش آتی۔ نیز جب

کہ وہ خود اس بات کے قائل ہیں کہ ساحر تمام حاضرین کی، باوجود ان کی کثرت کے چشم بندی کرسکتا ہے یہاں تک کہ وہ ایک چیز کو اس کے اصل صورت کے برخلاف مشاہدہ کرا سکتا ہے۔

بالفاظ دیگر وہ ان کے حواس میں حسب الارادہ تغیر پیدا کرسکتا ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ حاضرین یا غائبین کے بعض عوارض اور قویٰ وطبائع میں کوئی مطلوبہ تغیر پیدا کر دے؟ اور کیا قوت باصرہ اور دوسرے حواس اور قویٰ میں کوئی ایسا فرق موجود ہے جس کی وجہ سے ساحر کو یہ قدرت تو حاصل ہے کہ وہ اول الذکر میں حسب الارادہ تغیر پیدا کرے لیکن دوسرے حواس اور قویٰ میں تصرف کرنے سے وہ عاجز رہے؟ اور جب اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ ساحر اپنے جادو کے زور سے آنکھوں کے فعل میں اس قدر تصرف کرسکتا ہے کہ وہ ساکن کو متحرک اور متصل کو منفصل اور مردہ کو زندہ یا زندہ کو مردہ دیکھ لے تو بھلا اس سے کیا مانع ہے کہ وہ کسی دوسرے کی صفات نفسانی میں کوئی مطلوبہ تغیر پیدا نہ کرے؟ مثلاً جو اس کے نزدیک محبوب تھا اس کو مبغوض اور جو مبغوض تھا اس کو محبوب بنادے۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے ساحروں کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ سَحَرُوْا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَاءُوْا بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴾

(الاعراف:۷/۱۱۶)

”انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا اور ان کے دلوں میں سخت خوف پیدا کیا اور بہت بڑا جادو کا عمل کیا۔“

ایک تو اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنکھوں کے فعل میں تغیر پیدا ہونے کے علاوہ ان کے دلوں کی بھی حالت بدل گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ یہ تغیر یا تو اشیاء مرئیہ میں پیدا ہوا ہوگا۔ مثلاً ساحروں نے ارواح خبیثہ یعنی شیاطین سے اس بارے میں استعانت کی جنہوں نے رسیوں اور لاٹھیوں کو متحرک کردیا اور ناظرین نے یہ خیال کیا کہ یہ چیزیں بذات خود حرکت کررہی ہیں جیسے کہ بازی گر غیر مرئی تاروں کے ذریعہ سے کسی چیز کو حرکت میں لاتے اور ناظرین خیال کرتے ہیں کہ وہ چیز خود بخود حرکت کررہی ہے۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں یہ تغیر پیدا ہو گیا ہو۔ چنانچہ انہوں نے رسیوں اور لاٹھیوں کو حرکت کرتا ہوا دیکھا لیکن درحقیقت وہ متحرک نہیں تھیں اور اس میں شک نہیں کہ ساحر دونوں طرح کا تصرف کر سکتا ہے۔ کبھی تو خود دیکھنے والے کے صفحات میں تصرف کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو چیزیں غیر اصلی حالت میں نظر آتی ہیں اور کبھی وہ ارواح خبیثہ سے استعانت کر کے نفس اشیاء میں تغیر پیدا کرتا ہے۔

منکرین تاثیر سحر کا رد:

منکرین کا قول ہے کہ ساحران فرعون نے رسیوں اور لاٹھیوں پر ایسا عمل کیا جس سے ان میں حرکت پیدا ہوئی چنانچہ بعض کہتے ہیں کہ انہوں نے اس میں پارہ بھر دیا تھا جس پر دھوپ کا اثر ہوا تو وہ حرکت کرنے لگیں لیکن منکرین کا یہ قول باطل ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان اشیاء کی حرکت خیال اور چشم بندی کا نتیجہ نہ ہوتا جیسے آیت بالا میں اس کی تصریح ہے، بلکہ ان کی حرکت حقیقی ہوتی اور ان کے اس عمل کو سحر کہنا درست نہ ہوتا بلکہ یہ ایک دستکاری ہوتی جو اکثر لوگ عمل میں لا سکتے ہیں اور ان کے اس عمل کی حقیقت ناظرین سے پوشیدہ نہ رہتی۔

خصوصاً جب کہ سینکڑوں عقلائے روزگار اس مجلس میں موجود تھے۔ علاوہ ازیں اگر ساحران فرعون کا کارنامہ ان کی دستکاری اور عیاری کا نتیجہ ہوتا تو بجائے اس کے کہ اس کے ابطال کے لیے عصا کا معجزہ ظہور میں لایا جائے بہتر ہوتا کہ لوگوں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کیا جاتا اور ان کا پارہ وارہ نکال کر ان ڈینگ مارنے والے ساحروں کے ڈھول کا پول کھول دیا جاتا۔ نیز فرعون کو اطراف ملک سے ماہرین فن سحر کو بلانے اور ان کے ساتھ غیر معمولی انعام واکرام کا وعدہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس عمل کو معمولی مداری نہایت آسانی کے ساتھ انجام دے سکتے تھے۔ الغرض یہ ایسا باطل قول ہے جس پر مزید بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔

فصل ہشتم

شر کی چوتھی قسم

استعاذہ من شر حاسد:

﴿ وَمِنۡ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الۡعُقَدِ ﴾

''میں حاسد کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جب کہ وہ حسد کرتا ہے۔''

اس آیت کریمہ میں چوتھے شر کا ذکر ہے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ حاسد کا نفس حسد محسود شخص کے لیے شر و تکلیف کا باعث ہے۔ اور اگر اپنے ہاتھ اور زبان سے محسود کو ضرر پہنچانے کی کوشش نہ بھی کرے تب بھی اس کا خبث باطن ایک ایسا شر ہے جس سے پناہ مانگنا لازم ہے۔

حسد کا اثر مسلمہ ہے:

قرآن کریم میں کوئی لفظ مہمل نہیں اور ہر ایک لفظ کے ذکر کرنے سے مخاطب کے ذہن میں کسی خاص حقیقت کا منقوش کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح آیت مذکورہ میں اِذَا حَسَـــــدَ کا لفظ بڑھانے میں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حاسد اس شخص کو کہتے ہیں جس کی ذات میں حسد موجود ہو لیکن بعض اوقات وہ اپنی اس صفت سے غافل ہوتا ہے مگر جب ہی اس کے دل میں حسد کا خیال آیا اور اس کے دل میں آگ کا ایک شعلہ بھڑک اٹھا جس کی چنگاریوں کا محسود تک پہنچنا بہت اغلب ہوتا ہے اس لیے اگر محسود اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور حمایت میں پناہ نہ لے اور اس کی طرف متوجہ ہو کر اور دعوات ماثورہ میں مشغول نہ ہو تو یقیناً حاسد کی آتش حسد کے شعلے اس کو جھلسا دینے میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ اب تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ اِذَا حَسَـــــدَ کا لفظ بڑھانے میں یہی نکتہ ہے کہ اس کا شر اس وقت متعدی ہوتا ہے جب کہ اس کے دل میں بالفعل حسد کی آگ بھڑک اٹھے۔

نظر بد کا اثر:

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جبرئیل علیہ السلام کی دعا کے یہ الفاظ تم کو یاد ہوں گے:

((من شر کل نفس او عین حاسد)) [1]

اس حدیث میں حاسد کی آنکھ سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے۔

لیکن یہ ایک معلوم بات ہے کہ حاسد کی آنکھ کے مجرد دیکھنے سے کچھ اثر نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر وہ کسی چیز کو یا اپنے محسود کو اس نظر سے دیکھے جیسے کہ وہ پہاڑ اور دریا وغیرہ کو دیکھتا ہے اور اس کے دل میں حسد کا جذبہ بالفعل موجزن نہ ہو تو محسود کو اس کے شر کا کچھ خطرہ نہیں لیکن وہ حسد کی کیفیت سے رنگین ہو کر اپنے محسود پر نظر ڈالے جب کہ اس کے دل میں غضب اور انتقام بے جا کے خبیث جذبات موجزن ہوں تو کچھ شک نہیں کہ اس کی یہ نظر نفس حاسد کی قوت اور ضعف کی حالت کے مطابق محسود پر اپنا اثر ڈالے گی۔

اگر اس کے جذبات خبیثہ طاقتور ہوں گے تو یہ ممکن ہے کہ وہ محسود کو اپنی نظر سے ہلاک کر دے یا بیمار بنا دے اور بہت سے لوگ اپنے تجربہ سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں اس نظر بد کا اثر نفس خبیثہ کے ذریعہ ہوتا ہے جو اس کی سمیت کا اثر ہوتا ہے جیسے کہ سانپ جب کہ اس میں قوت غضبیہ جوش زن ہوتی ہے اور وہ اس حالت میں کسی کو کاٹ لے تو اس کی سمیت کا اثر مہلک ہوتا ہے۔ سانپوں کے بعض اقسام میں یہ کیفیت بہت قوی ہوتی ہے یہاں تک کہ صرف گھورنے سے کسی شخص کو اندھا کر دیتے ہیں اور عورت کا اس سے اسقاط حمل ہو جاتا ہے۔

جیسے کہ ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے بھی لنڈورے سانپ اور ذوالطفیتین [2] کا یہی اثر بیان فرمایا ہے۔ [3]

---

[1] صحیح مسلم، کتاب السلام، باب الطب والمرضی والرقی، رقم: ۲۱۸۶/۴۰۔ سنن ترمذی، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی التعوذ للمریض، رقم: ۹۷۲۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الطب، باب ما عوذ بہ النبی وما عوذ بہ، رقم: ۳۵۲۳

[2] ذو الطفیتین وہ سانپ ہے جس کی آنکھوں کے نیچے دو سیاہ نقطے ہوتے ہیں۔ مترجم

[3] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب قول اللہ تعالی: وبث فیھا من کل دآبۃ، رقم: ۳۲۹۷

جب کہ سانپ میں ایسی کیفیت کا پیدا ہونا ممکن ہے جس کے اثر سے ایک انسان اندھا ہوسکتا ہے اور کسی عورت کا حمل ساقط ہوسکتا ہے اس لیے اگر کسی شریر اور خبیث نفس میں قوت غصبیہ کی آگ اور آتش انتقام مشتعل ہوکر جب وہ محسود کی طرف متوجہ ہو تو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی زہریلی شعاعوں سے جو اس کی پرغضب اور پرحسد آنکھوں سے نکلتی ہیں، اپنے محسود کو ہلاک کرڈالے یا کسی مرض میں مبتلا کردے یا کسی اور طرح پر اس کو تکلیف پہنچائے؟

نظر بد کے اثر سے جو شخص بیمار ہوتا ہے بسا اوقات اس کو حکیم اور ڈاکٹر لاعلاج بتلاتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بیماری کا تعلق عالم طبیعت سے نہیں بلکہ عالم ارواح سے ہے اور اس کی حقیقت قوت روحانی کا اجسام اور طبائع میں اثر کرتا ہے۔ اس کا علم خاص خاص لوگوں تک محدود ہے اور جو لوگ اس کوچہ سے نابلد ہیں وہ اپنی جہالت کے باعث اس سے منکر ہیں۔

عالم اجسام اور عالم ارواح:

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اجسام بذات خود لکڑی اور پتھر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، ان سے جو عجیب وغریب افعال صادر ہوتے ہیں اور ان میں جو حیرت انگیز اثرات پیدا ہوتے ہیں، ان کے ظہور کا راز قوائے روحانیہ میں مضمر ہے۔ تمام اجسام درحقیقت روحانی قوتوں کے لیے بہ منزلہ آلات اور اوزار کے ہیں۔

جس صاحب عقل نے عجائبات عالم پر نظر غائر ڈالی ہے اور اس نے ارواح اور اجسام کے تعلق پر محققانہ غور کیا ہے وہ جانتا ہے کہ اس عالم اجسام اور عالم شہادت کو چھوڑ کر ایک اور عالم ہے جس کو ارواح یا عالم غیب کہتے ہیں جس کی قوائے عاملہ نہ صرف نظروں سے بلکہ جملہ حواس کے ادراک سے بالاتر ہیں اور اس عالم میں جو کچھ بھی تصرفات ہوتے ہیں وہ تمام تر حواس خمسہ کے دائرے سے باہر اور عالم ظاہر میں نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس عالم اجسام میں صرف ان کے آثار مشاہدہ کیے جاسکتے ہیں اور اس لیے اکثر ظاہر پرست اس وجود کے قائل نہیں۔

عالم ارواح کا مشاہدہ:

عالم ارواح کو عالم اجسام پر قیاس مت کرو، وہ عالم اس عالم سے بہت بڑا اور وسیع ہے اور اس کے عجائبات عام عجائبات سے بہت بڑھ کر ہیں۔ تمہاری نظر عالم ارواح کے عجائبات کا مشاہدہ کرنے سے قاصر ہے یا تمہیں اس کے وجود میں تامل ہے۔

پہلی مثال:

اپنی ہستی پر غور کرو اور دیکھو کہ ایک روح کے چلے جانے سے بدن کی کیا کیفیت ہوجاتی ہے؟ وہی انسان جو علوم وفنون کا ماہر، صنعت ہائے عجیب وغریب کا مظہر ہر سائنس کے دقائق پر حاوی، فلسفہ کا استاد اور ملک داری اور سیاست کی عقدہ کشائی کرنے والا تھا۔ کس طرح ایک لمحہ میں روح کی مفارقت کر جانے کی وجہ سے ایک تعفن پذیر نعش بن جاتی ہے، جس میں حس وحرکت تک باقی نہیں رہتی۔

﴿ وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ (الذاریات:۵۱/۲۱)

''تمہارے اپنے نفسوں میں قدرت کی نشانیاں موجود ہیں کیا تم نہیں دیکھتے ہو (اندھے ہو؟)۔''

کیا انسان کی یہ قوت گویائی، اشیاء کو دیکھنے کی عجیب وغریب قوت، سماعت اور دیگر صفات اس کے دلی جذبات از قسم محبت اور عداوت، اس کی قوت متفکرہ اور دیگر قویٰ اور احساسات اسی جسم ظاہر کے آثار ومظاہر ہیں؟ نہیں ہرگز نہیں، موت کے بعد بھی جسم تو بعینہ موجود ہوتا ہے اور اس کے تمام اعضاء بھی بظاہر اسی طرح صحیح وسالم نظر آتے ہیں، لیکن اس وقت وہ چیز اس میں نہیں جس کو روح کہتے ہیں اور جو حواس کے ادراک سے بالاتر ہے۔

دوسری مثال:

ایک شخص نہایت قوی ہیکل اور بظاہر خوبصورت بھی ہوتا ہے لیکن اس کو تم پسند نہیں کرتے ہو اور تمہارے دل میں اس کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا

شخص ہے جو نہایت نحیف اور لاغر اندام ہے، چنداں خوبصورت بھی نہیں اس کی تمہارے دل میں عزت ہے اور بعض اوقات تم اس کو جان سے بھی عزیز سمجھتے ہو۔ اس فرق کی فلاسفی پر بھی تم نے کبھی غور کیا؟ سوائے اس کے اس کی اور کوئی وجہ نہیں کہ اول الذکر سے تم کو روحانی منافرت ہے اور موخر الذکر نے اپنی روحانی قوت سے تم کو اپنی محبت پر مجبور کر رکھا ہے:

﴿ ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ. ﴾ (الانعام:٦/٩٦)

خلاصہ یہ ہے کہ اسباب اور مسببات اور علت اور معلول کا وجود اسی عالم اجسام اور طبائع تک محدود نہیں۔ بعض اسباب خفیہ عالم ارواح میں ایسے ہیں جن تک تمہاری کوتاہ نظر کی رسائی نہیں البتہ ان کے آثار ونتائج کو تم اس عالم میں مشاہدہ کر سکتے ہو۔ الغرض ہر ایک اثر یا واقعہ کے لیے طبعی اسباب ڈھونڈنے پر اکتفا نہ کرو۔ بہت سے امور کا سبب اور اس کی علت فاعلہ عالم غیب یا عالم ارواح میں ہوتی ہے۔

فصل نہم

عاین اور حاسد میں اشتراک وافتراق!

قوت مقناطیسی:

نظر بد لگانے والا اور حاسد من وجہ ایک جیسے ہیں، لیکن ایک دوسری وجہ سے دونوں میں فرق ہے۔ اس بات میں وہ دونوں ایک جیسے ہیں کہ ہر ایک کا نفس خاص کیفیت سے رنگین ہو کر اپنی توجہ کو کسی ایک مرکز پر مبذول کرتا ہے اور جس پر یہ توجہ مبذول کی جاتی ہے وہ ہدف ایذا وتکلیف بنتا ہے اور بعض اوقات اس کا انجام ہلاکت ہوتا ہے۔

اب فرق سنیے! نظر لگانے والے کی آنکھوں میں جو مسموم اثر پایا جاتا ہے وہ صرف اس شخص یا چیز پر اثر کرتا ہے جس کے ساتھ وہ دوچار ہوئے لیکن حاسد کے لیے حاضر اور غائب یکساں ہے۔ نظر بد لگانے والے کے دل میں بھی اکثر حسد کا جذبہ موجود ہوتا ہے لیکن بعض اوقات اس کا اثر ایسی چیزوں پر بھی ہوتا ہے جن سے ان کو حسد نہیں ہوتا۔ مثلاً پتھر یا حیوان

یا کھیتی وغیرہ۔

نیز بعض اوقات اس کا اثر اپنی جان اور اپنے مال وغیرہ پر بھی ہوتا ہے کیوں کہ نظر کا اثر اس شخص یا چیز پر ہوتا ہے جو صاحب نظر کو مستحسن معلوم ہو اور پھر وہ اس کو گھور کر دیکھ لے ارشاد ہے:

﴿ وَ اِنْ یَّكَادُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ. ﴾ (القلم:٦٨/٥١)

''قریب ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا تم کو اپنی آنکھوں (کی مقناطیسی) کے ذریعہ سے اپنی جگہ اور اپنے مرکز سے ہٹا دیں، اس حالت میں جب کہ وہ کلام پاک سنتے ہیں۔''

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد نظر بد کے اثر سے آپ کو ایذا پہنچانا ہے، چنانچہ روایت ہے کہ بعض ایسے اشخاص جو نظر بد کے لیے مشہور تھے آنحضرت ﷺ کے سامنے لائے گئے اور انہوں نے آپ کو گھور کر کہا کہ ہم نے تو کبھی ایسا آدمی نہیں دیکھا اور نہ کسی کا ایسا چبھتا ہوا کلام سنا۔

یہ اس قسم کے اشخاص تھے کہ جب کسی فربہ اونٹنی پر ان کی نظر پڑ جاتی تھی تو ان کو اپنی نظر بد کے اثر پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ اپنے غلام سے کہہ دیتے تھے کہ یہ ٹوکری لے لو اور فلاں شخص کی اونٹنی کا گوشت لے آؤ، اور ایسا ہی ہوتا تھا کہ ان کے گھورنے پر وہ اونٹنی زمین پر گر کر لوٹنے لگتی اور اس کا مالک اس کو مجبوراً ذبح کرتا۔

کلبی کہتا ہے کہ عرب میں ایک شخص تھا جو (اپنی نظر بد کے اثر کو تیز کرنے کے لیے) ایک دو دن کا کھانا چھوڑ دیتا تھا، اور پھر جب کوئی اونٹ یا بھیڑ بکری اس کے پاس سے گزرتی اور وہ کہہ دیتا کہ میں نے تو ایسا اونٹ وغیرہ نہیں دیکھا تو وہ فوراً گر پڑتا۔ اس شخص سے کافروں نے درخواست کی کہ وہ آنحضرت ﷺ کو اپنی نظر بد کا نشانہ بنائے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے اپنے رسول کو محفوظ ومصئون رکھا اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

لیکن ایک دوسری جماعت مفسرین کی یہ کہتی ہے کہ اس سے مراد نظر بد کا اثر پہنچانا نہیں

بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کافر لوگ جب تم کو قرآن پڑھتا ہوا سنتے ہیں تو تمہاری طرف عداوت کی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں اور ان کا یہ دیکھنا اس شدت سے ہوتا ہے کہ قریب ہے تم کو گرادیں۔

زجاج نے یہی قول اختیار کیا ہے اور یہ کلام عرب میں موجود ہے کہ فلاں شخص نے اس کو ایسی تیز نظر سے دیکھا کہ قریب تھا وہ گر جائے، زجاج کہتا ہے اس کا قرینہ یہ ہے کہ اس کو سماعِ قرآن کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ لوگ قرآن کریم کا سننا سخت ناپسند کرتے ہیں اور اس لیے جب اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ تم کو بسبب بغض اور عداوت کے سخت تیز نظروں سے دیکھنے لگ جاتے ہیں۔

مہلک نظر کے اسباب واثرات:

میں کہتا ہوں (یعنی علامہ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں) کہ جو نظر مہلک اثر پیدا کرتی ہے اس کا سبب بعض اوقات حسد اور عداوت ہوتا ہے اور جیسے کہ حاسد کے نفس خبیث کا محسود پر موذی اور مہلک اثر پڑتا ہے اسی طرح اس نظر بد لگانے والے کا بھی اثر پڑتا ہے اور اس کا اثر اس وجہ سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے کہ سامنے ہونے کی حالت میں قوت نفسانی اپنا عمل زائد کرتی ہے۔ کیونکہ دشمن جب نظروں سے غائب ہو تو ممکن ہے کہ انسان اس کی عداوت کو نظر انداز کر جائے لیکن اس کو دیکھ کر پوشیدہ جذبات تموج پر آجاتے ہیں اور نفس بالکلیہ محسود کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، اس لیے اس حالت میں نظر قوی کا اثر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جس پر یہ نظر ڈالنا مقصود ہوتا ہے بعض اوقات وہ گر جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کو بخار ہو جاتا ہے اور کبھی وہ غش کھا جاتا ہے۔

اس قسم کے واقعات اکثر مشاہدہ میں آتے ہیں اور بہت لوگوں نے ایسا ہوتے دیکھا ہے۔ بعض اوقات اس نظر بد کا سبب صرف ''پسندیدگی'' ہوتا ہے اور عام طور پر اسی کو نظر بد کہا جاتا ہے۔ کیونکہ کسی چیز کو جب بہ نظر استحسان دیکھا جاتا ہے تو دیکھنے والے کے نفس میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے اور چونکہ بعض خبیث طبائع میں ایک زہریلا مادہ موجود ہوتا ہے کہ اس کیفیت کے ظہور میں آتے ہی اس کا بھی ظہور ہوتا ہے اس لیے اس کا نتیجہ اس شخص یا چیز کی

ہلاکت یا نقصان ہوتا ہے جس پر وہ نظر ڈالی گئی ہے۔

نظر بد ایک حقیقت!

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((العین حق)) ❶

''نظر بد کا لگنا ایک حقیقت ہے۔'' یعنی محض توہم پرستی نہیں۔

عبید بن رفاعہ سے روایت ہے کہ اسماء بنت عمیس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جعفر کی اولاد اکثر نظر بد کا شکار ہو جاتی ہے تو کیا ہم ان کے لیے دم وغیرہ کا عمل کریں؟ آپ نے اس بات کا جواب اثبات میں دیا اور فرمایا اگر کوئی چیز تقدیر سے آگے بڑھ سکتی تو وہ نظر بد ہوتی ہے۔ ❷

الغرض کافر لوگوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد اور عداوت تھی اور تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ حاسد کی نظر قوی تر ہوتی ہے، اس لیے جن مفسرین نے یہ کہا کہ اس روایت سے مراد نظر بد کا اثر ڈالنا ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ وہ حسد اور عداوت کی نظروں سے آپ کو دیکھتے تھے جس کا اثر ہر طرح سے مسلم ہے۔

لیکن جن مفسرین نے یہ کہا کہ اس آیت سے مراد نظر بد کا اثر نہیں وہ اس لحاظ سے درست کہتے ہیں کہ کافروں کا دیکھنا ''پسندیدگی'' کا دیکھنا نہیں تھا جس کو عام اصطلاح میں نظر بد کہا جاتا ہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسان کی نظر بد سے پناہ مانگا

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الطب، باب العین حق، رقم: ۵۷۴۰ ۔صحیح مسلم، کتاب السلام ،باب الطب والمرضی والرقی، رقم: ۲۱۸۷/۴۱

❷ سنن ترمذی، کتاب الطب، باب ما جاء فی الرقیة من العین، رقم: ۲۰۵۹ ۔سنن ابن ماجه، کتاب الطب، باب من استرقی من العین، رقم: ۳۵۱۰

کرتے تھے۔"[1]

اگر نظرِ بد میں کوئی شر نہ ہوتا تو آپ اس سے کیوں پناہ مانگتے۔ نیز ترمذی میں حابس بن حبہ تمیمی کی ایک روایت ہے کہ میرے باپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ "نظرِ بد کا لگنا ایک حقیقت ہے۔"[2]

نظرِ بد اور تقدیر:

ایک دوسری حدیث میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اگر کوئی چیز تقدیر سے آگے بڑھ سکتی تو وہ نظرِ بد ہوتی۔"[3] اس کے بعد ترمذی نے لکھا ہے کہ اس بارے میں ایک حدیث عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اور یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔

عاین بھی حاسد ہے:

نظرِ بد لگانے والا بھی ایک قسم کا حاسد ہے، لیکن عام حاسدوں سے وہ زیادہ مضر ہے۔ اور غالباً اسی نکتہ کے لیے سورۂ فلق میں حاسد کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے کیونکہ عام کے ضمن میں خاص داخل ہوتا ہے یعنی ہر ایک نظرِ بد لگانے والا حاسد ہے لیکن بالعکس نہیں اس لیے جب حاسد کے شر سے پناہ مانگ لی گئی تو نظرِ بد سے بھی پناہ لی گئی۔ حسد کی حقیقت اللہ تعالیٰ کی کسی دی ہوئی نعمت کے زوال کی خواہش کرنا، حاسد خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا دشمن ہے اور شر اس کی طبیعت میں مرکوز ہوتا ہے جو اس کے خبث فطرت کا نتیجہ ہے۔

جادو اور حسد:

برعکس حسد کے سحر اور جادو کا شر فطری نہیں بلکہ اکتسابی ہے، جیسے کہ پہلے ذکر ہوا اس میں شیاطین کی ارواح خبیثہ سے استعانت کی جاتی ہے۔

---

[1] سنن ترمذی، کتاب الطب، باب ماجاء فی الرقیة بالمعوذتین، رقم:۲۰۵۸۔ سنن ابن ماجه، باب من استرقی من العین، رقم:۳۵۱۱

[2] سنن ترمذی، کتاب الطب، باب ماجاء ان العین حق والغسل لها، رقم:۲۰۶۱

[3] سنن ترمذی، کتاب الطب، باب ماجاء ان العین حق والغسل لها، رقم:۲۰۶۲۔ صحیح مسلم، باب الطب والمرضی والرقی، رقم:۴۲

موضوعِ سورتین:

اس سورۂ شریفہ میں ساحر اور حاسد کے شر کا ذکر کر کے شر کی دونوں قسموں فطری اور اکتسابی کی تصریح کر دی گئی ہے سحر اور حسد کا شر شیاطین الانس اور شیاطین الجن دونوں سے مقصود ہے لیکن شر کی ایک اور قسم ہے جو صرف موخر الذکر سے صادر ہوتی ہے یعنی وسوسہ جس کے ذکر کے لیے دوسری سورۃ کو مخصوص فرمایا ہے۔

ساحر اور حاسد کا عمل:

ساحر اور حاسد خارج سے اپنا عمل کرتا اور ایذا پہنچاتا ہے۔ مسحور یا محسود کے عمل کو اس میں دخل نہیں۔ لیکن وسوسہ کا عمل اس وقت مضر ثابت ہوتا ہے جب کہ انسان کا قلب اس کی طرف مائل ہو اور اس کو قبول کر لے اور اس لیے وسوسہ کے نتیجہ کے طور پر اگر انسان کسی عمل بد کا ارتکاب کر بیٹھے یا اس ارتکاب کا عزم مصمم کر لے تو وہ مواخذہ کے قابل ہے کیونکہ یہ اس کے اپنے ارادہ اور سعی واکتساب کی عقوبت ہوگی۔ برخلاف اس کے ساحر اور حاسد کے شر کی عقوبت کے وہ خود مستوجب ہوں گے، محسود اور مسحور کا اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ لہٰذا ساحر اور حاسد کا ایک سورۃ میں ذکر کیا گیا اور شیطان کے وسوسہ کا دوسری میں۔ بعض اوقات حسد اور سحر کی دونوں صفتیں ایک دوسری کے ساتھ مناسبت رکھنے کی وجہ سے ایک ہی ذات میں جمع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً یہود کی قوم ساحر بھی تھی اور حاسد بھی۔ ان کے سحر کا ذکر ان آیتوں میں ہے:

﴿ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي

الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ط وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ط لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾
(البقرۃ:۲/۱۰۲)

”ان لوگوں نے اس علم کی پیروی کی جو (حضرت) سلیمان (علیہ السلام) کی سلطنت میں شیطان پڑھا کرتے تھے اور (حضرت) سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا بلکہ ان شیطانوں نے کفر کیا تھا۔ جو لوگوں کو جادو اور وہ علم سکھلاتے تھے جو بابل میں دو فرشتوں (ہاروت اور ماروت) پر اترا تھا اور وہ (دونوں فرشتے) کسی کو اس وقت تک وہ علم نہ سکھلاتے تھے جب تک کہ وہ یہ نہ کہتے تھے کہ ہم تو (تمہارے لیے) ایک آزمائش ہیں (اس لیے تم ہم سے علم سیکھ کر) کفر مت کرو۔ پس وہ لوگ (باوجود ان فرشتوں کی اس تنبیہ کے) ان سے ایسا علم سیکھتے تھے جس سے وہ مرد اور اس کی عورت کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں (اس علم سے) وہ لوگ سوائے اللہ تعالیٰ کے حکم کے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ بلکہ (ان سے) ایسا علم سیکھتے ہیں جس سے ان کو خود نقصان پہنچتا ہے اور ان کو (اس علم سے) کچھ نفع نہیں پہنچتا اور وہ لوگ (اس بات کو بھی) جان چکے ہیں کہ جو شخص اس علم کا خریدار ہوا (علم سیکھا) اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں رہتا۔ البتہ اگر ان لوگوں کو سمجھ ہوتی تو جان لیتے کہ وہ چیز (علم کا سیکھنا) بہت بری چیز ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا ہے۔

اور ان کے حسد کے ذکر سے تو تقریباً قرآن کریم بھرا پڑا ہے جیسے:

﴿ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ. ﴾ (النساء:۴/۵۴)

”کیا وہ لوگوں کے ساتھ اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو نعمتیں دیں۔“

وغیرہ وغیرہ۔ اور اگرچہ ساحر کے ساتھ بھی شیطان ہوتا ہے لیکن حاسد خود شیطان کے

مشابہ ہوتا ہے کیونکہ شیطان کو فساد سے محبت ہے اور وہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا زوال چاہتا ہے اور حاسد بھی انہیں اوصاف کے ساتھ موصوف ہے۔ سب سے پہلے ابلیس علیہ اللعنۃ نے حضرت آدم علیہ السلام کے شرف اور فضیلت پر حسد کیا تھا جس کا نتیجہ انکار سجود اور ملعونیت ابدی کی شکل میں ظاہر ہوا۔

قوی تر جادو:

سحر کی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ساحر اللہ اور رسول کی مخالفت میں جتنا زیادہ سرگرم ہوا اتنا ہی وہ اپنے فن میں زیادہ ماہر ہوتا ہے اور اس لیے بت پرستوں کا جادو اہل کتاب کے جادو سے اور یہودیوں کا جادو نام نہاد مسلمانوں کے جادو سے قوی تر ہے۔

مؤطا امام مالک رحمہ اللہ میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے کہ مجھ کو تورات کے چند ایک کلمات یاد ہیں (جن کی برکت سے میں جادو کے اثرات سے محفوظ رہتا ہوں) ورنہ بصورت دیگر مجھ کو یہودی لوگ گدھا بنا تے۔ وہ کلمات یہ ہیں:

((اعوذ بوجه الله العظیم الذی لیس شیء اعظم منه و بکلمات الله التامات التی لایجاوزهن بر و لا فاجر و باسماء الله الحسنی ما علمت منها و مالم اعلم من شر ما خلق و ذراء و براء.)) [1]

”میں اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں جس سے بڑھ کر کوئی نہیں اور اللہ تعالیٰ کے کامل کلام کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں جس سے کوئی نیک یا برا تجاوز نہیں کرسکتا۔ اور میں اللہ تعالیٰ کے بہترین اسمائے پاک کے ساتھ پناہ مانگتا ہوں خواہ وہ مجھ کو معلوم ہیں یا میرے علم سے باہر ہیں۔ ہر ایک ایسی چیز کے شر سے جس کو اس نے پیدا کیا اور پھیلایا۔“

---

[1] مؤطا امام مالك، كتاب الشعر، باب مايؤمر من التعوذ

فصل دھم

استعاذہ ''من شر حاسد اذا حسد''

معانی:

اللہ تعالیٰ کا یہ قول:

﴿ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ﴾

جن اور انسان دونوں کا شامل ہے۔ شیطان اور اس کی جماعت مؤمنوں کے ساتھ اس فضل وانعام کی وجہ سے جو ان کے ساتھ کیا گیا ہے حسد کرتے ہیں جیسے کہ ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ کیا تھا۔ وہ اور اس کی اولاد بھی اسی طرح دشمن ہے۔

﴿ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۝ ﴾ (فاطر:٦/٣٥)

''بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے اس لیے تم بھی اس کو اپنا دشمن قرار دو۔''

لیکن شیاطین الجن کا کام زیادہ تر وسوسہ ڈالنا ہے اور شیاطین الانس کا کام حسد کرنا ہے۔ اگر چہ درحقیقت دونوں قسم کے شیطانوں میں دونوں اوصاف فی الجملہ پائے جاتے ہیں۔ اس لیے

﴿ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝ ﴾

کا لفظ دونوں کے شر سے پناہ مانگنے پر مشتمل ہے۔

سورۂ فلق کا خلاصہ:

یہ سورۃ تمام عالم کے شرور سے پناہ مانگنے پر مشتمل ہے اور وہ چار استعاذہ کے کلمات اپنے اندر رکھتی ہے۔ پہلے میں مخلوقات کے عام شر سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے، دوسرے میں شب تاریک کے شب سے پناہ طلب کی گئی ہے۔ تیسرے اور چوتھے میں ساحر اور حاسد کے شر سے استعاذہ کیا گیا ہے۔ ان دونوں کا شر نفس خبیثہ کی شرارت کا نتیجہ ہے جن میں سے اول الذکر یعنی ساحر شیطان سے مدد کا خواہاں اور اس کی عبادت میں مشغول رہتا ہے۔

ساحر اور شیطان:

عموماً جادو کا عمل شیطان کی عبادت کرنے اور اس کا تقرب حاصل کیے بغیر مؤثر نہیں ہوتا۔ مثلاً یا تو وہ شیطان کے نام پر ذبح کرتا ہے یا اس ذبح سے مقصود اس کا تقرب ہوتا ہے:

﴿ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ ﴾ (البقرۃ:۲/۱۷۳)

میں اسی کی حرمت بیان کی گئی ہے اسی طرح اور بھی اس سے شرکیہ اعمال سرزد ہوتے ہیں جن کو اگرچہ وہ خود دوسرے ہی ناموں سے موسوم کرے لیکن درحقیقت وہ شیطان کی پرستش اور اس کی عبادت ہوتی ہے۔

شرک اور کفر اسمائے مخفیہ نہیں بلکہ ان کا اطلاق ایک حقیقت پر ہوتا ہے جہاں بھی وہ پائی جائے اس کی توضیح ایک مثال سے ہوسکتی ہے: ایک شخص مخلوق کے لیے سجدہ کرتا ہے لیکن اس کو زمیں بوس وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرا یہ سجدہ عبادت کے لیے نہیں بلکہ تعظیم کے لیے ہے۔ میرا سجدہ سجدۂ عبادت نہیں بلکہ سجدۂ تحیت ہے تو اس کے اس کہنے سے اس کی حقیقت میں تغیر واقع نہیں ہوتا۔ اور بلحاظ حقیقت کے وہ سجدہ عبادت ہی کہلائے گا، اور اس کا مسجود اس کا معبود ہوگا خواہ اس کا فاعل کتنا ہی اس سے بیزاری کا اظہار کرے۔ [1]

شیطان کی عبادت:

اسی طرح ایک شخص شیطان کو خوش کرنے کے لیے ذبح کرتا ہے اس کو پکارتا ہے اور اسی سے پناہ مانگتا ہے تو شیطان کو اس نے معبود قرار دیا اگرچہ وہ خود اپنے اس فعل کو عبادت سے موسوم نہ کرے بلکہ اس کو استخدام وغیرہ کے نام سے تعبیر کرے، [2] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] مثلاً شراب محرم کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی پینے کی چیز جو سکر پیدا کرے۔ اب اگر کوئی اس کو نبیذ یا مثلث وغیرہ کے ناموں سے پکارے تو اس سے اس کی ماہیت میں فرق نہیں آتا اور نہ ہی مسلمان کے لیے اس کا پینا حلال ہوگا۔ اسی طرح حلالہ کا نکاح چونکہ دراصل نکاح نہیں زنا ہے اس لیے نکاح کے ساتھ موسوم کرنے سے اس کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ مترجم

[2] جیسے کہ نام نہاد مسلمانوں میں عامل وکاہن اس قسم کی حرکات کو استخدام کہتے ہیں یہ اسی کی طرف اشارہ ہے

﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ.﴾ (یس:٣٦/ ٦٠، ٦١)

''کیا میں نے تمہاری طرف اپنا پیغام نہیں بھیجا کہ اے آدم کے بیٹے! شیطان کی عبادت مت کرو بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اور تم کو چاہیے کہ میری ہی عبادت کرو۔''

اس آیت کریمہ میں شیطان کے نقش قدم پر چلنے کو عبادت سے تعبیر کیا ہے، حالاں کہ کوئی بھی اپنے منہ سے نہیں کہتا کہ میں شیطان کی عبادت کرتا ہوں، دوسری جگہ کلام پاک میں ارشاد ہے:

﴿ وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِیَّاكُمْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ. قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ.﴾ (سبا:٣٤/ ٤٠۔٤١)

''اس دن کو یاد کرو جب کہ ہم ان سب کو زندہ کر کے جمع کریں گے اس کے بعد ملائکہ سے مخاطب ہوں گے کہ کیا یہ لوگ تمہاری عبادت میں مشغول رہتے تھے؟ ملائکہ اس کا جواب عرض کریں گے کہ تو پاک اور بے عیب ہے، تو تمہارا کارساز ہے، وہ نہیں بلکہ یہ لوگ تو شیطانوں کی عبادت کرتے تھے۔''

باوجودیکہ یہ لوگ عبادت ملائکہ کے مدعی تھے لیکن پھر بھی ان کو شیطان کا عابد قرار دیا گیا۔

عبادت لغیر اللہ:

ان دونوں آیتوں سے نہایت واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شرک وکفر اور عبادت غیر اللہ بھی دوسرے بامعنی اسماء کی طرح ایک خاص مفہوم اور حقیقت رکھتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی وہ مفہوم اور حقیقت پائی جائے وہیں ان الفاظ کا اطلاق ہوگا، چاہے اس کا ارتکاب کرنے والا اپنے اس فعل کو خالص توحید اور ایمان ہی سے تعبیر کرے۔ [1]

---

[1] الغرض کسی کی اپنی تعبیر کا کچھ بھی اعتبار نہیں۔ ہمیشہ حقیقت کو ملحوظ رکھا جائے۔ ====

الغرض یہ تو ساحر کا حال ہے جو شیطان سے استعانت کرتا اور اس کی عبادت میں مشغول رہتا ہے۔ لیکن اس کے دوسرے بھائی حاسد کی شیطان خود مدد کرتا ہے کیونکہ وہ اس کا سچا نائب اور خلیفہ ہے۔ دونوں کو یہ گوارا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنی نعمتوں سے بہرہ ور فرمائے بلکہ وہ ہمیشہ دوسروں کے زوال کے متمنی رہتے ہیں۔

فصل یازدہم
حاسد کے شر پر اذا حسد کی قید

ایک نکتہ:

یہ بھی قابل غور ہے کہ حاسد کے شر کو اذا حسد (جب کہ وہ حسد کرے) کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، کیوں کہ بعض اوقات ایک شخص کے دل میں حسد موجود ہوتا ہے لیکن وہ اس کو دبائے رکھتا ہے اور اس کی زبان سے یا ہاتھ سے محسود کو کچھ بھی ضرر نہیں پہنچتا ہے بلکہ وہ اپنے بھائی مسلمان کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ کرنا چاہیے اور جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے۔ اس قسم کا حسد مضر نہیں اور عموماً اس سے آدمی خالی نہیں رہتا مگر جس کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

مؤمن حاسد:

حسن بصری رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ کیا مومن حاسد ہوسکتا ہے؟ آپ نے جواب دیا، کیا تم نے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا قصہ بھلا دیا ہے؟

==== یہ ایک قابل قدر تحقیق ہے اور اس کو یاد رکھنا لازم ہے کیونکہ اس تحقیق کو مدنظر نہ رکھنے سے بڑی بڑی غلطیاں واقع ہوتی ہیں۔ اکثر مدعیان علم و دانش اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہمارے زمانہ کے مسلمان چاہے اولیاء کرام کے حق میں کتنا ہی غلو رکھتے ہوں لیکن وہ ان کو اپنا معبود اور خدا کا شریک نہیں کہتے، حالانکہ یہ ایک سادہ حقیقت ہے کہ جب وہ ان کو انہیں صفات کا مظہر سمجھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو مشرک اور عابد لغیر اللہ نہ خیال کیا جائے۔ فتامل! مترجم)

الغرض مؤمنوں کے دل میں حسد کا پیدا ہونا ممکن ہے لیکن وہ اپنے اس جذبہ کی اطاعت نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو مقدم سمجھتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے خوف وحیا کرتا ہے اور جس بات کو وہ پسند کرتا ہے اس کو مبغوض رکھنا پسند نہیں کرتا اور اس لیے وہ کسی سے زوال نعمت کے خیال کو دل میں جاگزیں ہونے نہیں دیتا۔ بلکہ اس کو ہٹانے میں مشغول رہتا ہے اور محسود کے لیے زیادتی خیر اور دوام نعمت کی دعا کرتا رہتا ہے۔ برخلاف اس کے جب حسد کا اثر انسان کے اعضاء اور جوارح میں ظاہر ہو تو وہ حسد مذموم ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا۔

حسد کے مراتب:

حسد کے تین مراتب ہیں:

(۱) یہ کہ وہ دوسرے سے کسی نعمت کا زوال چاہتا ہے۔

(۲) کوئی شخص جہالت یا تنگدستی یا کمزوری یا پریشانی قلب وغیرہ میں مبتلا ہے اور وہ اس شخص کے حق میں یہ نہیں چاہتا کہ اس کی یہ حالت تبدیل ہو اور اللہ تعالیٰ اس پر فضل فرما کر ان مصائب سے ان کو نجات دے اور اپنی رحمت کا حق دار فرمائے!

ان دونوں مراتب میں یہ فرق ہے کہ پہلے موجود اور محقق نعمت اور دوسرے میں متوقع نعمت پر حسد کیا جاتا ہے۔ لیکن دونوں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کو مبغوض جاننے والے ہیں۔ اس کے بندوں کے دشمن اور دونوں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت مبغوض ہیں۔ لوگ بھی ان کو اپنا دشمن خیال کرتے ہیں اور اس لیے وہ اپنی مرضی سے کسی حاسد کو اپنا سردار نہیں بننے دیتے اور نہ کوئی ایسے شخص کی غمخواری اور ہمدردی کرتا ہے۔ لوگ اس شخص کا سردار ہونا پسند کرتے ہیں جو ان کے ساتھ احسان کرے اور ہمدردی سے پیش آئے۔ حاسد کی حکومت اور سیادت کو وہ اپنے حق میں ایک بلا اور مصیبت خیال کرتے ہیں۔ الغرض حاسد لوگوں کو مبغوض سمجھتا ہے اور وہ اس کو مبغوض سمجھتے ہیں۔

(۳) حسد کی تیسری قسم غبطہ ہے اس میں دوسرے سے زوال نعمت کی خواہش نہیں کی جاتی۔ بلکہ ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ جو کمال اور نعمت دوسرے کو حاصل ہے وہ مجھ کو بھی حاصل ہو

ہوجائے۔ غبطہ کو مجازاً حسد کہا جاتا ہے ورنہ وہ کوئی معیوب وصف نہیں بلکہ ایک مرغوب اور محمود صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کا حال بیان کر کے فرمایا ہے:

﴿ وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ. ﴾ (المطففين:۸۳/۲۶)

''اور ایسے ہی اعلیٰ مقام کے حاصل کرنے کے لیے رشک کرنے والوں کو رشک کرنا چاہیے۔''

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

''صرف دو ہی آدمی ہیں، جن کے حال پر حسد کرنا (رشک کرنا) جائز بلکہ مستحسن ہے۔ ایک وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو اور پھر اس کو راہ حق میں خرچ کرنے کی توفیق بخشی ہو۔ دوسرا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے علم نافع عطا فرمایا ہے، جس سے خود بھی مستفیض ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتا ہے۔''[1]

اس قسم کے حسد یعنی غبطہ کا محرک ہمت عالیہ ہوتی ہے جو اس قسم کے اعمال کرنے پر ابھارتی ہے اور اہل خیر وصلاح کے ساتھ مشابہت حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ کسی دوسرے پر جو انعام اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وہ اس سے زائل ہو بلکہ اس کے حق میں اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتیں برقرار رہنے کی خواہش رکھنے کے علاوہ یہ چاہتا ہے کہ وہ خود بھی انعام الٰہی تعالیٰ شانہ کا مورد ہو۔

حسد کی یہ قسم آیت کریمہ

﴿ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝ ﴾

کے مفہوم میں داخل نہیں۔ اس آیت کریمہ میں حسد کی پہلی دو قسموں کے شر سے پناہ مانگنا مقصود ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، باب انفاق المال فی حقه، رقم:۱۴۰۹۔ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین،باب فضل من یقوم بالقرآن ویعلمه، رقم:۲۶۸/۸۱۶۔ مسنداحمد(۱/۳۸۵) رقم:۳۶۵۱

اور محسود کو ایک بہترین علاج کی تعلیم دی گئی ہے کیونکہ اس کا ماحصل اللہ تعالیٰ کی طرف التجا کرنا اور اسی کے فضل وعنایت پر بھروسہ کرنا ہے اور حاسد کی شرانگیزیوں کی کچھ بھی پرواہ نہ کر کے مولائے نعم کی طرف رجوع کرنے کی اس میں تلقین ہے۔ گویا کہ محسود یہ کہتا ہے کہ بار خدایا! تو نے مجھ کو اپنی نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے، میں تجھ سے اس شخص کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو مجھ سے ان نعمتوں کو چھیننا چاہتا ہے۔

جائے پناہ:

یہ ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو اپنا جائے پناہ قرار دے اور اسی پر بھروسہ کرے اللہ تعالیٰ اس کو تمام پریشانیوں سے نجات دے کر اس کو بے فکر کر دیتا ہے۔

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ.﴾ (الطلاق:٦٥/٣)

''جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کافی ہے (اس کو کسی دوسرے کے در پر ملتجی ہونے کی مطلق ضرورت نہیں)۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَوْلٰكُمْ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ.﴾ (الانفال:٨/٤٠)

''وہی اللہ تعالیٰ تمہارا آقا کارساز ہے اور وہ بہت ہی اچھا آقا اور نہایت ہی اچھا مددگار ہے۔''

تم اس کی نصرت کو دور نہ سمجھو، اس کے نزدیک مشکل سے مشکل کام کرنا آسان ترین بات ہے۔

﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰى اَمْرِهٖ، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ.﴾

(یوسف:١٢/٦٢)

''اللہ تعالیٰ جس کام کو کرنا چاہتا ہے اس پر غالب اور قادر ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت واقعیہ سے ناآشنا ہیں۔

ہر ایک مسلمان کو صرف اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ.﴾ (آل عمران:٣/١٢٢)

''تمام مسلمانوں کو صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔''

اور فقط اسی سے ڈرنا چاہیے۔

﴿ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰه. ﴾ (الاحزاب:۳۳/۳۹)

''اللہ تعالیٰ کے رسولوں کی یہ صفت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور اس کے بغیر کسی سے نہیں ڈرتے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی اور کا بھی خوف دل میں رکھتا ہے اس کے توکل علی اللہ میں اتنا ہی نقص ہوگا۔

﴿ اِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ. اِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُوْنَ ﴾

(النحل:۱۶/۹۹۔۱۰۰)

''بے شک شیطان کا ان لوگوں پر کچھ بھی تسلط نہیں جو ایمان لائے اور وہ صرف اپنے مالک خدا پر ہی بھروسہ رکھتے ہیں۔ بے شک وہ انہیں لوگوں پر غلبہ پاتا ہے جو اسی کے دوست بنے رہتے ہیں اور جو شیطان کی متابعت کر کے مشرک ہوتے ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. ﴾ (آل عمران:۳/۱۷۵)

''بے شک یہ تمہارا شیطان ہی تو ہے جو اپنے دوستوں کے دل میں خوف ڈالتا ہے اس لیے تم اس سے مت ڈرو اور اگر تم ایمان لائے ہو تو مجھ سے ہی ڈرو۔''

فصل دوازدھم

حاسد کے شر کا دفعیہ

حاسد کا شر دس اسباب کے ذریعہ دفع کیا جا سکتا ہے۔

پہلا سبب: استعاذہ باللہ:

اللہ تعالیٰ کے ساتھ پناہ مانگنا اور اس کی طرف ملتجی ہونا۔ اسی کی سورۂ فلق میں تصریح ہے قرآن کریم میں ہے:

﴿ وَ اِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴾ (الاعراف: ۷/ ۲۰۰)

"اگر تم کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پیش آئے تو تم کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پناہ مانگو۔ بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے!

اس سننے سے مراد دعا کا قبول کرنا ہے جیسے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بڑھاپے میں بیٹا عطا کیے جانے کا ذکر کر کے کہا:

﴿ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴾ (ابراھیم: ۱٤/ ۳۹)

"بے شک میرا رب دعائیں قبول کرنے والا ہے۔"

سمیعٌ کے ساتھ بعض جگہ علیمٌ اور بعض جگہ بصیرٌ مقام کی مناسبت کی وجہ سے ذکر کیا گیا ہے۔ جہاں کسی ایسے دشمن کا ذکر ہے جس کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ اور وہ پوشیدہ طور پر شرارتیں کرتا ہے، جیسے شیطان، وہاں پر علیم کا لفظ استعمال کرنا مناسب تھا، کیونکہ علیم غیر مرئی چیزوں پر محیط ہوتا ہے۔ جہاں کسی ایسے دشمن کا ذکر ہے جس کو آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے اور جس کی شرارتیں نظر سے پوشیدہ نہیں رہتیں، وہاں پر بصیر کا لفظ زیادہ موزوں ہے، جس کے معنی ہیں دیکھنے والا۔ چنانچہ اس آیت میں ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِیْ

صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (المؤمن: ٤٠/ ٥٦)

''بے شک وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے بارے میں غیر نازل شدہ دلیل کے ساتھ جھگڑتے رہتے ہیں، ان کے سینوں میں تکبر بھرا ہوا ہے جہاں تک ان کی رسائی نہیں اس لیے تم کو چاہیے کہ ان کے شر سے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ پناہ مانگو، بے شک وہ سننے والا دیکھنے والا ہے!۔''

اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ قرآن کریم میں اسمائے حسنیٰ کا استعمال نہایت موزوں اور مناسب مقام پر ہوا ہے (یہ نہیں کہ کہیں ایک اسم رکھ دیا کہیں دوسرا)۔

دوسرا سبب: خشیت الٰہی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل:

اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور اس کے امر اور نہی کو بجالانا، کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور تقویٰ اختیار کرتا ہے، خود اللہ تعالیٰ اس کا نگہبان اور متولی ہوتا ہے اور اس کو کسی دوسرے کے حوالے نہیں کرتا۔

﴿ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا.﴾ (آل عمران: ٣/ ١٢٠)

''اگر تم صبر واستقلال اور تقویٰ اختیار کرو تو ان حاسد کافروں کی سازشیں تم کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

''اللہ تعالیٰ کا خیال رکھو گے تو تم اس کو اپنے سامنے پاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کا لحاظ رکھو گے تو وہ تمہارا نگہبان ہوگا۔''[1]

تم جانتے ہو کہ جس کو اللہ رکھے اس کو کون چکھے۔

---

[1] شعب الایمان للبیہقی (١/ ٥١٤) رقم: ١٩٢

تیسرا سبب: الصبر علی عدوہ:

اپنے دشمن کے مقابلے میں صبر کرنا اور اس کے ایذاء پہنچانے اور تکلیف دینے کا خیال تک دل میں نہ لانا، کیونکہ صبر اور توکل علی اللہ کا ثمرہ ہمیشہ دشمن پر فتح اور کامیابی کی صورت میں ہوتا ہے۔ بے شک بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی نصرت (انسان کے اپنے تخمینہ کے بموجب) کسی قدر دیر سے پہنچتی ہے، لیکن تم کو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے اور دشمن کے بغی اور عدوان کو دیکھ کر بے صبر نہیں ہونا چاہیے۔ مظلوم اپنی کوتاہ نظری کے باعث صرف بغی اور عدوان کو دیکھ سکتا ہے، لیکن اس کا مآل اور انجام ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اس (مظلوم) کی کامیابی پر ہوتا ہے۔

﴿ وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ. ﴾ (الحج:۲۲/ ۶۰)

”جس شخص پر ظلم کیا گیا اگر وہ اسی مقدار میں (انصاف کی حدود سے تجاوز کرکے) اس کا انتقام لے اور اس پر پھر دوبارہ تعدی کی جائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا اور اس کو دشمن پر فتح عطا کرے گا۔“

کیا اللہ تعالیٰ کے اس موکد وعدے میں تمہیں شک ہے؟ یہ آیت کریمہ اس کے حق میں ہے جس نے ایک مرتبہ بقدر اپنے حق کے انتقام لیا ہو اور پھر اس پر زیادتی کی گئی۔ لیکن جس نے ابتداء میں صبر کیا اور اپنے آپ کو انتقام سے باز رکھا کیا اس کے حق میں بطریق اولیٰ نصرت کا یہ وعدہ نہیں ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ ہمیشہ ظالم کو سزا دیتا ہے، معروف مقولہ ہے: اگر ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ پر ظلم کرے تو خدا کا قانون اس کو ہموار کیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔

چوتھا سبب: توکل علی اللہ:

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا، کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتا ہے، وہ اس کو تمام مہمات سے بے فکر کر دیتا ہے۔ اگر مخلوق کی طرف سے تم کو کوئی ایسی تکلیف پہنچے جن کو تم اپنی قوت اور اپنی طاقت سے رفع نہیں کر سکتے تو ایسی حالتوں میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا اور اس کی نصرت کا امیدوار رہنا کامیابی اور فتح مندی کا قوی ترین سبب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

﴿ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ. ﴾ (الطلاق:۶۵/ ۳)

''جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھتا ہے وہ اس کے لیے کافی ہے۔''

اس لیے جس کی خبر گیری کا خود اللہ تعالیٰ ضامن ہے بھلا وہ بھی کبھی ناکام ہوسکتا ہے؟

ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى.﴾ (آل عمران:۳:۱۱۱)

''تمہارے دشمن تم کو ہرگز ضرر نہ پہنچا سکیں گے، البتہ تم کو کسی قدر تکلیف پہنچے گی۔''

آخری فقرے کا مقصد ان تکالیف کا پیش آنا ہے جن سے قانون قدرت نے کسی انسان کو مستثنیٰ نہیں فرمایا، جیسے گرمی اور سردی اور بھوک اور پیاس وغیرہ۔ علاوہ ازیں بعض تکلیفیں جو انسان کو پہنچتی ہیں وہ در حقیقت اس کے لیے فائدہ بخش ہوتی ہیں:

﴿وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ.﴾ (البقرة:۲/۲۱۶)

''ممکن ہے کہ تم ایک بات کو ناپسند کرو لیکن وہی تمہارے حق میں بہتر ہو۔''

اس لیے کسی ایسی تکلیف کے درمیان جو انسان کے حق میں خیر کثیر کا باعث ہو، اور ایسی تکلیف جس سے دشمن اپنا جی ٹھنڈا کرے بہت بڑا فرق ہے۔ متوکل علی اللہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے دوسری قسم کی تکلیفات سے بچانے کا ذمہ لیا ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ اس کو پہلی قسم کی کوئی تکلیف پیش آئے۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ ہر ایک عمل کی جزا اس کی جنس سے ہوتی ہے اور چونکہ متوکل علی اللہ نے تمام دوسری اشیاء سے منہ موڑ کر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر بھروسہ کیا ہے، اس لیے آیت مذکورہ:

﴿وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ.﴾ (الطلاق:۶۵/۳)

کے بموجب خود اللہ تعالیٰ اس کا ضامن ہے اور کفیل بنا ہے، اس لیے کوئی شخص سچے طور پر اللہ تعالیٰ پر توکل کرے تو اگر زمین و آسمان مل کر اس کے برخلاف سازش کریں، تب بھی اللہ تعالیٰ اس کو ان کی سازش کے شر سے محفوظ رکھ کر اس کی نصرت فرمائے گا۔ توکل کی حقیقت، اس کے فوائد اور اس کی ضرورت کا ہم نے اپنی کتاب الفتح القدسی میں مفصل بیان کیا ہے۔ ❶

---

❶ اگر کسی کو یہ کتاب نہ ملے تو وہ امام غزالی رحمہ اللہ کی کتاب احیاء العلوم میں باب التوکل کا مطالعہ کرے۔

ہم نے وہاں اس بات پر بھی بحث کی ہے کہ جولوگ اس مقام کومعلوم کہتے ہیں اور عوام کے مقامات سے خیال کرتے ہیں، ان کا یہ قول باطل ہے جس کے دلائل ہم نے وہاں پر مفصل بیان کیے ہیں اور اس بات کی تصریح کی ہے کہ توکل کا مقام عارفین کے بلند ترین مقامات میں سے ہے اور کسی عارف کا مرتبہ کتنا ہی بلند ہو وہ اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے توکل کی مقدار سے اس کے ایمان کا درجہ معلوم ہوتا ہے۔

پانچواں سبب: قلب وفکر کو حسد سے خالی رکھنا:

اپنے دل کو حاسد کے ساتھ مشغول رکھنے اور اس کے بارے میں کچھ سوچنے سے بالکل بچایا جائے اور اگر اس قسم کا کوئی خطرہ دل میں پیدا ہوتو اسے مٹانے کی فکر میں مصروف ہو اور اس کی طرف التفات اور توجہ تک نہ کرے۔ یہ اس کے شر کو رفع کرنے کا زبردست علاج ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص کو اس کا دشمن اس لیے ڈھونڈتا ہے کہ وہ اس سے دست وگریبان ہوجائے تو اس صورت میں اگر وہ اپنے دشمن سے گتھم گتھا ہوجائے تو یقیناً وہ بہت کچھ تکلیف پائے گا اور دشمن کو اس پر زور آزمائی کرنے کا موقع مل جائے گا۔لیکن اگر وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہو اور اس سے بالکل بے اعتنائی کرے تو اس حالت میں اس کے شر سے بچا رہے گا۔

ارواح کی بعینہٖ یہی کیفیت ہے۔ حاسد کی روح اپنے محسود کو ایذا پہنچانے اور تکلیف دینے کی طرف ہر وقت متوجہ رہتی ہے اس لیے اگر محسود کی روح بھی اس کی طرف متوجہ ہو تو دونوں کے درمیان ایک دائمی آویزش کی صورت پیدا ہوجائے گی اور دونوں کی روح اس وقت تک بے چین اور مضطرب رہے گی جب تک ایک ان میں سے ہلاک نہ ہوجائے، لیکن اگر محسود اپنے قوائے روحانی اور آلات فکر کو ادھر متوجہ ہونے نہ دے اور اگر بالفرض اس قسم کا کوئی خطرہ اس کے دل میں پیدا ہو تو اس کو مٹانے اور زائل کرنے میں مشغول ہو، یہ طرز عمل اس کے حق میں بہت زیادہ مفید ہوگا۔

حسد ایک آگ ہے جس کے لیے ایندھن کی ضرورت ہے اور جب محسود ایسا طرز عمل اختیار کرے جس سے اس کو مطلق ایندھن نہ ملے تو اس کے شعلے خود حاسد کو بھسم کر ڈالیں گے

اور محسود اس کے شر سے محفوظ رہے گا۔

نفوس شریفہ اپنے دشمنوں کے حق میں یہی رویہ اختیار کرتے ہیں اور اس میں ایک ایسی روحانی حلاوت ہے کہ جس نے ایک مرتبہ اس کا مزہ چکھ لیا ہو اس کو اپنے دشمن کے خیال میں منہمک ہونا اور اپنے قوائے روحانی اور آلات فکر کو ادھر متوجہ رکھنا ایک مصیبت اور عذاب معلوم ہوتا ہے، ان کو اللہ تعالیٰ کی نصرت پر پورا بھروسہ ہوتا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ہماری اپنی کوششیں اللہ تعالیٰ کی کفالت کے سامنے ہیچ ہیں، اس کے وعدے سچے اور اس کی نصرت تمام دوسرے نصرت کے اقسام سے بڑھ کر ہے:

﴿ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ ﴾ (التوبہ: ۹/ ۱۱۱)

''اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اور کون اپنے وعدوں کا سچا ہے؟''

﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا ﴾ (النساء: ٤/ ۱۲۲)

''اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کون اپنے قول میں سچا ہو سکتا ہے؟''

لیکن اس سبب خاص پر عمل کرنے کی اسی سعادت مند کو توفیق ملتی ہے جس نے چھٹے سبب پر عمل کیا ہو، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

چھٹا سبب: رضائے الٰہی کی تلاش میں استغراق:

اپنی توجہ کو نہایت اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے پر مرکوز رکھے اور اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی محبت اور اخلاص سے اس حد تک معمور کر دے کہ جہاں پر خواطر نفسانی اور وساوس شیطانی کا گزر ہوا کرتا تھا وہاں پر اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے لیے اخلاص اور اس کی خوشنودی کی طلب لبالب بھری ہو۔ اس کی مثال ایک محبّ صادق کی ہو، جس کا باطن اپنے محبوب کے خیال سے اس قدر بھرپور ہوتا ہے کہ اس میں یاد محبوب کے بغیر اور کسی چیز کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی۔

ایسی حالت میں وہ اس بات کو کب گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے قلب میں حاسد کا خیال جاگزیں ہو اور اس سے انتقام لینے کی فکر میں مشغول ہو؟ ایسے خیالات صرف اس دل میں آ سکتے

ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی خوشنودی کی طلب نے جگہ نہ بنائی ہو، بے شک جن دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے اخلاص نے گھر کر لیا ہے، ان کا نگہبان خود خدائے پاک ہے اور وہ دشمن کے تسلط سے محفوظ رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں ارشاد فرماتا ہے کہ جب ابلیس کو اپنی نجات سے مایوسی ہوئی تو اس نے بارگاہ رب العزت میں عرض کی:

﴿ قَالَ فَبِعِزَّتِکَ لَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ. اِلَّا عِبَادَکَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ. ﴾ (ص:۳۸/۸۲۔۸۳)

''تیری عزت کی قسم یقیناً ان سب کو گمراہ کردوں گا لیکن تیرے مخلص بندے اس سے بچے رہیں گے۔''

آگے از راہ تصدیق ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ. ﴾

(الحجر:۱۵/۴۲)

''بے شک میرے بندگان خاص پر تمہارا کچھ بھی تسلط نہیں ہوگا بلکہ تمہاری جماعت میں وہی گمراہ داخل ہوں گے جو باختیار خود تمہاری پیروی کریں گے۔''

یوسف علیہ السلام کے بارے میں وارد ہے:

﴿ کَذٰلِکَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ. ﴾ (یوسف:۱۲/۲۴)

''اسی طرح ہم نے اس سے برائی اور بے حیائی کو دور کیا کیونکہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔''

جو شخص اس قلعہ میں داخل ہوا وہ بڑا سعادت مند ہے، وہ ہر قسم کے خوف سے امن میں رہے گا اور دشمن اس کے قریب نہیں جا سکے گا۔

ساتواں سبب: گناہوں سے استغفار:

آدمی کو اپنے گناہوں سے تائب ہونا چاہیے کیونکہ دشمن کے مسلط ہونے کا سب سے بڑا سبب انسان کے اپنے گناہ ہوتے ہیں۔

﴿ وَمَآ اَصَابَكُم مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيكُمْ.﴾(الشوریٰ:٤٢/ ٣٠)

''جو مصیبت بھی تم کو پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کا کسب وعمل ہے۔''

آنحضرت ﷺ کے صحابہ کرام کو (جو اس امت کے برگزیدہ ترین افراد کا مجموعہ تھے) جنگ احد کے موقع پر اس طرح مخاطب کیا گیا ہے:

﴿ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ط قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ط قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ﴾ (آل عمران:٣/١٦٥)

''کیا جب تم کو مصیبت پہنچی بحالیکہ تم اس سے دگنی مصیبت اپنے دشمنوں کو پہنچا چکے تھے تو تم کہنے لگے کہ ہیں! یہ مصیبت کہاں سے؟ اے محمد ﷺ ان سے صاف کہہ دیں کہ یہ مصیبت تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔''

الغرض انسان کو جو تکلیف بھی آئے وہ اس کے گناہوں کا نتیجہ ہوگا خواہ اس کو اپنے ان گناہوں کا علم ہو یا نہ ہو کیونکہ جن گناہوں کا انسان کو علم ہوتا ہے ان سے کئی گنا زیادہ ایسے گناہ ہوتے ہیں جن کا اس کو علم نہیں ہوتا اور وہ ان کو بھول جاتا ہے، ایک مشہور دعائے ماثورہ ہے:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ شَيْئًا وَّاَنَا اَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا اَعْلَمُ.)) ❶

''بار خدایا! میں تیرے ساتھ اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں نے دانستہ تیرے ساتھ کسی کو شریک بنایا ہو اور میں ان گناہوں کی تجھ سے معافی چاہتا ہوں جن کو میں نہیں جانتا۔''

---

❶ مسند ابو یعلی (١/ ٦١، ٦٢) رقم: ٥٤، ٥٥

اس لیے آدمی کو لازم ہے کہ وہ اپنے ان گناہوں کی بابت بھی معافی اور مغفرت کی دعا کرے جن کو وہ نہیں جانتا ہے اور جن کی شامت سے اس کو مصائب اور تکالیف پیش آتی ہیں۔

ایک بزرگ سے منقول ہے کہ کسی نے اس سے سخت کلامی کی اور برا بھلا کہا، وہ بزرگ فوراً اپنے گھر میں داخل ہوا اور دروازہ بند کر کے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کبریائی میں تضرع کی اور گڑگڑایا اور اپنے دانستہ یا نادانستہ گناہوں کی بابت بخشش طلب کی، تب باہر نکل کر اس شخص سے اس طرح مخاطب ہوا۔ ''میں نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ہے جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تم کو مجھ پر مسلط فرمایا تھا۔''

ہم کسی موقع پر ذکر کریں گے کہ جہاں بھر میں جتنی شر کی قسمیں پائی جاتی ہیں وہ بنی نوع انسان کے گناہوں اور ان کے نتائج واسباب تک محدود ہیں [1] اگر انسان گناہوں سے سلامت رہے تو بالضرور ان کے نتائج سے بھی سلامت رہے گا۔ اس لیے اگر کسی شخص پر دشمن مسلط ہوا اور اس پر تعدی کرے اور اس کو تکلیف پہنچائے تو اس کے لیے مفید ترین تدبیر یہ ہے کہ وہ سچے دل سے توبہ کرے اور اس کی سعادتمندی اسی میں ہے کہ بجائے اس کے دشمن سے انتقام لینے کی فکر کرے، اپنے گناہوں اور عیوب پر نظر ڈالے، اور ان سے تائب ہو کر اپنے اعمال کی اصلاح میں مشغول ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت اور اس کی نصرت فرمائے گا۔

آٹھواں سبب: صدقہ اور نیکی کا عمل لازم گردانا:

تا حد امکان صدقہ دینا اور نیکی کرنا۔ بلا، مصیبت، نظر بد اور حسد کا شر دفع کرنے میں اس کا اثر حیرت انگیز ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم اور زمانہ حال میں مختلف لوگوں نے تجربے کیے اور اب یہ بات مسلم ہو چکی ہے کہ صدقہ دینے والے اور نیکی کرنے والے اشخاص نظر بد اور حسد کے شر سے محفوظ رہتے ہیں اور اگر ان کو اس سے کوئی مصیبت پہنچ بھی جائے تو اس کی عاقبت محمود ہوتی ہے،

---

[1] الجواب الکافی میں مصنف رحمہ اللہ نے اس پر مفصل بحث کی ہے اس کا اردو ترجمہ چھپ گیا ہے۔ مترجم

اور اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم اور اس کی تائید ان کے شامل حال رہتی ہے۔ صدقہ دینے والے محسن کے لیے اس کا صدقہ اور احسان ایک قلعہ ہے، ایک سپر ہے جو اس کا محافظ ہوتا ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر نعمت کو زوال سے محفوظ رکھتا ہے اور نعمت کے زائل ہونے کا ایک قوی ترین سبب حاسد کا حسد ہے جس کا دل نعمت زائل ہوئے بغیر ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ اس لیے آدمی کو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکر کرنا چاہیے جس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے میں صرف کیا جائے، اور یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مصیبت سے بڑھ کر اور کوئی چیز نعمت کو زائل نہیں کرتی، اور اسی کا نام کفران نعمت ہے جس کا مآل بعض اوقات یا اکثر اوقات کفر ہوتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

نواں سبب: آتش حسد کو احسان سے بجھانا:

حاسد کی آتش حسد کے شراروں کو اس کے ساتھ احسان کر کے بجھایا جائے اور جس قدر وہ تعدی میں زیادتی کرے اتنا ہی اس کے ساتھ احسان زیادہ کرے اور اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کر کے ہر طرح اس کی اعانت کرے لیکن دشمن سے اس قسم کا سلوک کرنا نفس پر نہایت ہی شاق گزرتا ہے اور بہت کم خوش نصیب اور سعادت مند لوگوں کو ایسا کرنے کی توفیق ملتی ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

﴿ وَ لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَ لَا السَّیِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَ بَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ. وَ مَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَ مَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ. ﴾ (حم سجدہ: ۴۱/ ۳۴، ۳۵)

”نیکی اور برائی ایک جیسی نہیں، تم برائی کے بدلے میں اچھا سلوک کرو جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا دشمن تمہارا سرگرم دوست بن جائے گا لیکن اس کی توفیق انہیں دی جاتی ہے جو صبر اور ثابت قدمی کی صفت سے موصوف ہیں اور اس پر عمل کرنے والا کوئی بڑا ہی سعادت مند ہوگا۔“

آنحضرت ﷺ نے ایک نبی علیہ السلام کا حال بیان فرمایا ہے کہ اس کی قوم نے راہ حق میں

اس کو پتھروں سے مار مار کر خون آلود کیا تو اس نے اپنے چہرے سے خون کو پونچھتے ہوئے کہا:

((اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ.)) ❶

''بار خدایا! میری قوم کو بخش دے کیونکہ وہ نہیں جانتے۔''

اس ایک ہی کلمے میں اس نے احسان کے چار مقام کو جمع کرلیا ہے:

(۱) ان کی سخت ترین برائی کو معاف کیا۔

(۲) ان کے لیے بخشش طلب کی۔

(۳) خود ان کے لیے ایک عذر پیش کیا کہ وہ نہیں جانتے۔

(۴) اللہ تعالیٰ کی مہربانی کو زیادہ قریب لانے کے لیے ان کی نسبت اپنی طرف کی اور کہا کہ میری قوم کو۔

جیسے کوئی شخص کسی حاکم کے پاس سفارش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ میرا غلام ہے، میرا بیٹا یا میرا دوست ہے، اس سے حاکم کی مہربانی کرنا اور شفاعت کو زیادہ مؤثر بنانا مقصود ہوتا ہے۔ اگرچہ اس مقام کا حاصل کرنا دشوار ہے لیکن پھر بھی اس کو آسان بنانے کا ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ تم اپنے دل میں سوچ لو کہ آخر تم نے بھی تو خدا کے گناہ کیے ہیں جن کی سزا سے تم خائف ہو اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے امیدوار ہو اور اس پر اکتفا نہیں بلکہ تم یہ بھی جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا فضل اور انعام فرمائے اور تم کو جنت میں داخل کرکے درجات عالیہ سے سرفراز فرمائے، جب تم اپنے حق میں اللہ تعالیٰ سے یہ سلوک چاہتے ہو تو اس سے پہلے تم کو چاہیے کہ خود اپنے حاسدوں اور بدخواہوں سے جو تمہارے گنہگار ہیں، عفو اور احسان کا سلوک کرو، یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی تم سے ایسا ہی سلوک کرے گا کیونکہ جزا عمل کے جنس سے ہوتی ہے۔ بصورت دیگر تم کو اللہ تعالیٰ سے اس قسم کے سلوک کی توقع رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں، علاوہ ازیں اگر تم اپنے

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب حدیث الغار، رقم: ۳٤۷۷۔ صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب غزوة احد، رقم: ۱۰۵/۱۷۹۲

دشمن سے درگزر کر کے اس کے ساتھ احسان کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس میں تمہاری امداد فرمائے گا اور تمہارے لیے یہ مشکل اور دشوار عمل آسان ہو جائے گا۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قرابت والوں کی شکایت کی کہ میں ان سے نیکی کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ برائی کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جب تک تم اس عمل پر قائم رہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ ایک (غیبی) مددگار رہے گا۔''❶

قطع نظر آخرت کے ثواب اور اجر کے اس دنیا میں بھی ایسا شخص لوگوں میں ہر دلعزیز ہوتا ہے اور وہ اس کے ثناء خواں رہتے ہیں اور دشمن کے مقابلے میں وہ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتے ہیں کیونکہ جو شخص کسی دوسرے کے ساتھ احسان کرتا ہے اور وہ دوسرا اس سے برائی کرتا ہے تو ہر ایک شخص فطری طور پر اول الذکر کا ساتھ دے گا اور دوسرا ان کے نزدیک قابل ملامت ہوگا اس لیے دشمن کے ساتھ احسان کر کے تم نے گویا نامعلوم طور پر اپنے لیے ساتھیوں اور مددگاروں کا لشکر بنا لیا جو نہ تم سے تنخواہ مانگتے ہیں اور نہ روٹی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

حاسد کے لیے ایسی صورت میں دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اس کے متواتر احسانات سے متاثر ہو کر حسد چھوڑ دے اور اس کا بندہ احسان بن جائے۔ اس صورت میں وہ دونوں شیر وشکر ہو کر ایک دوسرے کے دوست بن جائیں گے اور اگر بالفرض اس کا خبث نفس اس کو چھوڑنے نہیں دیتا۔ اور وہ اپنے محسود کو ضرر پہنچانے اور تکلیف دینے سے باز نہیں آتا تو اس کا انجام یقیناً حاسد کی ہلاکت ہوگا۔

الغرض تم اپنے حاسد اور بدخواہ کے ساتھ احسان کر کے اس کو نیچا دکھا سکتے ہو اور خود تم کو وہ سچی خوشی حاصل ہو سکتی ہے جس کا حصول انتقام کی حالت میں ہرگز متصور نہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، وہو الموفق والمعین۔

---

❶ صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب صلة الرحم وتحريم قطيعتها، رقم: ٢٢/٢٥٥٨۔ مسند احمد (٢/ ١٨١) رقم: ٦٧٠٠

اس مقام میں پورے ایک سو سے زائد دینی اور دنیاوی فوائد انسان کو حاصل ہوتے ہیں جن کی تفصیل کسی دوسرے موقع پر کی جائے گی۔ان شاءاللہ تعالیٰ۔

دسواں سبب:

عالم اسباب کو نظر انداز کر کے خالق حقیقی کو نفع وضرر کا مالک سمجھنا:

دسواں سبب ان سب کا جامع اور سب کا اسی پر مدار ہے یعنی تمام ظاہری اسباب سے اپنی نظر کو آگے بڑھا کر مسبب الاسباب پر اپنی نظر جمانا اور اس بات کا یقین رکھنا کہ تمام علل اور اسباب خالق تعالیٰ کے ارادے اور اس کی قدرت کے ساتھ وابستہ ہیں اور اس کے اذن کے بغیر کچھ بھی ضرر یا نفع نہیں پہنچا سکتے۔ وہی کسی کے دل میں ڈالتا ہے کہ تم سے احسان کرے اور کسی کے دل میں ایک ایسی صفت پیدا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ تمہارے ساتھ برائی کرنے پر آمادہ ہوتا ہے:

﴿ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ. ﴾ (یونس: ۱۰/۱۰۷)

''اگر اللہ تعالیٰ تم کو کوئی تکلیف پہنچائے تو سوائے اس کے اور کوئی بھی اس کو دور نہیں کر سکتا اور اگر وہ تمہارے حق میں بھلائی کرنا چاہے تو کوئی بھی اس کی مہربانی کو رد نہیں کر سکتا۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

''تم جان لو کہ اگر تمام لوگ اکٹھے ہو کر تم کو کوئی نفع پہنچانا چاہیں اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر نہ کیا ہو تو ہرگز تم کو وہ نفع نہیں پہنچا سکیں گے۔اسی طرح اگر وہ سب اکٹھے ہو کر تم کو کوئی تکلیف پہنچانا چاہیں جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تقدیر میں نہیں لکھی ہے تو وہ ہرگز تم کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے۔''[1]

---

[1] شعب الایمان للبیہقی (۱/ ۵۱٤) رقم: ۱۹۲

جب انسان اس حقیقت کو پیش نظر رکھ لے اور اپنی توحید کو خالص کرے تو اس کے دل سے ماسویٰ کا خوف نکل جاتا ہے اور وہ دشمن کی مخالفانہ کوششوں کو پرکاہ کی وقعت نہیں دیتا کیونکہ اس کی بیم وامید صرف اللہ تعالیٰ سے اور اس کی انابت اور توکل فقط اپنے رب جل شانہ پر ہوتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر وہ اپنے آلات فکریہ کو دشمن سے ڈرنے اور اس سے انتقام لینے کے خیال میں صرف کرے تو اس سے اس کی توحید میں نقصان آجائے گا جس کو وہ ہمیشہ خالص اور کامل رکھنا چاہتا ہے اور اس حالت میں خود اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرماتا اور اس کو حاسدوں اور دشمنوں کے شر سے بچاتا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَايُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ. ﴾

(الحج: ۲۲/ ۳۸)

''بے شک اللہ تعالیٰ مومنوں کی حمایت فرماتا ہے اور بے شک وہ ہر ایک خائن اور ناسپاس کو دوست نہیں رکھتا۔''

اس لیے اگر کسی شخص کا ایمان کامل ہے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی حمایت فرمائے گا کیونکہ اس کے وعدے سچے ہیں اور ان کے خلاف ہونا ناممکن ہے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اس کی حمایت کما حقہ نہیں فرماتا ہے تو یقین سمجھ لو کہ اتنا ہی اس کا ایمان ناقص ہوگا۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ جو بالکلیہ اپنے خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی بالکلیہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جو شخص بالکلیہ اللہ تعالیٰ سے منہ پھیر لیتا ہے اللہ تعالیٰ بھی بالکلیہ اس سے منہ پھیر لیتا ہے۔ لیکن جو شخص کبھی کبھی خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ بھی کبھی کبھی اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

الغرض توحید ایک مستحکم قلعہ ہے جو شخص اس کے اندر داخل ہوا، وہ تمام بینات اور مصائب سے مامون ہوگا۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس سے ہر ایک چیز ڈرتی ہے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا ہے وہ ہر ایک چیز سے ڈرتا ہے۔

استحضار مافات:

یہ پورے دس سبب ہیں جن کے ذریعہ حاسد، ساحر اور نظر بد لگانے والے کا شر دفع کیا جاسکتا ہے لیکن اس سے مفید تر کوئی بات نہیں کہ انسان بالکلیہ اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو اسی پر اس کا بھروسہ ہو اور کسی کا خوف نہ کرے اور نہ کسی سے امید رکھے، اس کا دل اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی کے ساتھ لٹکا ہوا نہ ہو اور نہ وہ کسی دوسرے کو مصیبت کے وقت پکارے یا اس سے فریاد خواہی کرے کیوں کہ جس کے دل میں کسی دوسری چیز کی محبت ہو اور اس کے ساتھ اس کا دل معلق ہو یا اس کی بیم و امید کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات پاک نہ ہو یا کسی دوسرے کا خوف اس کے دل میں جاگزیں ہو، وہ اسی غیر کے حوالے کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے اپنی نگہبانی اٹھالیتا ہے، یہی اللہ کا قانون حکمت ہے، اس میں تبدیلی نہیں آتی۔

فصل سیزدھم

سورۂ فلق کا ماحصل

چار فرقے:

سورۂ فلق کی تفسیر کے ضمن میں تمہیں بعض ایسے نافع اور مفید اصول بتادیے گئے ہیں جن کا جاننا انسان کے لیے ازبس لازم ہے کیونکہ وہ دین و دنیا کے سود و بہبود پر مشتمل ہیں۔ تم کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حاسد کے نفس اور اس کی آنکھوں میں ایک زہریلا اثر ہے اور شیاطین کی روحیں سحر و جادو کے ذریعہ سے اپنا اثر ظاہر کرتی ہیں۔ حاسد و شیاطین کے متعلق چار مختلف عقیدے لوگوں میں پیدا ہوئے ہیں۔

پہلا فرقہ، متکلمین و مادہ پرست:

(۱) پہلی جماعت نفوس ناطقہ اور جنوں کے وجود کی قائل ہے لیکن ان کی تاثیر کی منکر ہے۔ یہ ان متکلمین کا قول ہے جن کو قویٰ اور اسباب کی تاثیر سے انکار ہے۔

(۲) دوسری جماعت سرے سے ان کا وجود نہیں مانتی، ان کا قول ہے کہ انسان ایسی

ظاہری جسم اور خدو خال کا نام ہے جس میں چند ایک صفات اور اغراض موجود ہیں، لیکن روح یا نفس ناطقہ کا کوئی مستقل وجود نہیں، جن اور شیطان انسان کے اعراض ہیں جو اس کے ساتھ قائم ہیں۔ ❶

اکثر مادہ پرست اور بعض نام نہاد حکمائے اسلام کا یہی مذہب ہے، بعض متکلمین بھی اسی کے قائل ہیں جن کی سلف نے سخت مذمت کی ہے اور ان کو اہل بدعت وضلالت سے موسوم کیا ہے۔

دوسرا فرقہ: معتزلہ وغیرہ:

یہ فرقہ اس بات کا منکر ہے کہ نفس انسانی کا بدن سے الگ کوئی مستقل وجود ہے، لیکن جن اور شیطان کے مستقل وجود کے وہ قائل ہیں، معتزلہ اور بعض دیگر متکلمین کا یہی قول ہے۔

تیسرا فرقہ، کاہن وغیرہ:

اس فرقہ کا عقیدہ اس کے برعکس ہے، یعنی نفس انسانی کا بدن سے الگ مستقل وجود مانتے ہیں لیکن جن اور شیطان نفس انسانی ہی کے قوائے اور صفات کا نام ہے۔ مسلمان حکماء کی ایک بڑی جماعت اس قول کی تائید میں ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں جو عجیب وغریب اثرات اور خوارق عادات پائے جاتے ہیں وہ سب نفس انسانی کے مظاہر ہیں۔ سحر اور کہانت ❷ ان کے نزدیک نفس انسانی کے مظاہرۂ قویٰ کا کرشمہ ہے۔

---

❶ اعراض جمع عرض کی ہے، عرض اس کو کہتے ہیں جس کا بذات خود کوئی مستقل وجود نہ ہو بلکہ کسی دوسری چیز کے ضمن میں اس کا وجود پایا جائے، مثلاً سیاہی اور سفیدی، علم اور جہل وغیرہ کا بذات خود کوئی مستقل وجود نہیں بلکہ کسی چیز یا کسی انسان کے وجود سے ان کا وجود وابستہ ہے۔ مترجم

❷ آنحضرت ﷺ کی بعثت سے بیشتر عرب میں کثرت سے کاہن موجود تھے جو غیب دانی کے مدعی تھے اور پیشین گوئیاں کرتے تھے جن میں سے بعض پیشین گوئیاں ایک حد تک سچی ثابت ہوتی تھیں۔ ان لوگوں کے پیشہ کو کہانت کہتے ہیں۔ مترجم

شیخ بوعلی سینا اور اس کے اتباع کا یہی قول ہے اور انہوں نے اپنے اس قول کو یہاں تک وسعت دی ہے کہ رسولوں کے معجزات کو بھی اسی کی ایک قسم تصور کیا ہے، اھل ملل کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ رسولوں کے اتباع میں داخل نہیں۔

چوتھا فرقہ، اہل حق:

یہ فرقہ اتباع رسل اور اہل حق کا ہے جو اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انسان کا نفس ناطقہ اس کے بدن سے الگ ایک مستقل وجود رکھتا ہے۔ اسی طرح جن اور شیاطین کے لیے بھی وہ مستقل وجود مانتے ہیں، اور ان کے لیے وہی صفتیں ثابت کرتے ہیں جن کا اثبات اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور ان کے شر سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ پناہ مانگتے ہیں کیونکہ ان کا اعتقاد ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی ان کو شر سے بچانے والا نہیں۔

الغرض ان چار فرقوں میں سے یہی ایک فرقہ حق پر ہے، دوسرے فرقوں کے اقوال میں حق اور باطل دونوں باہم ملے ہوئے ہیں۔

وَاللّٰهُ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ.



باب ۳

تفسیر سورۃ الناس

﴿قُلْ اَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ٥ مَلِكِ النَّاسِ ٥ اِلٰهِ النَّاسِ ٥ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ٥ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ٥ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ ٥﴾

''(اے محمد ﷺ لوگوں سے) کہہ دے کہ (اے لوگو) میں تمام لوگوں کے بادشاہ اور تمام لوگوں کے معبود کی پناہ ڈھونڈتا ہوں، وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے وہ شیطان جو لوگوں کے دلوں میں وسوسہ (برے خیالات) ڈالتا رہتا ہے وہ جنوں سے ہو یا انسانوں سے۔''

استعاذہ برب الناس:

یہ سورۃ بھی پہلی سورۃ کی طرح استعاذہ اور مستعاذ بہ اور مستعاذ منہ پر مشتمل ہے، استعاذہ کی تو وہی تفصیل ہے جس کا ذکر سورۃ فلق میں گزر چکا ہے۔

فصل اول

مستعاذبہ اور مستعاذ منہ

معانی:

مستعاذ بہ: جس کے ساتھ پناہ لینا مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ ہے۔ جس کو ان صفات سے موصوف کیا گیا ہے:

﴿بِرَبِّ النَّاسِ ٥ مَلِكِ النَّاسِ ٥ اِلٰهِ النَّاسِ ٥﴾

''تمام لوگوں کا پرورش کرنے والا، تمام لوگوں کا بادشاہ، تمام لوگوں کا معبود۔''

مستعاذ منہ (جس سے پناہ لی گئی ہے) شیطان ہے جس کے شر کے ساتھ ان اسمائے پاک کی مناسبت کا ہونا ضروری ہے، اس لیے ہم پہلے ان تینوں الفاظ کی اضافت کا مفہوم ظاہر کرتے ہیں اور اس کے بعد مناسبت کی وجہ ذکر کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

رب کی تفسیر:

رب الناس میں الناس کی طرف رب کا لفظ مضاف کیا گیا ہے، جس کا اشتقاق ربوبیت سے ہوا ہے، جس کے معنی ہیں لوگوں کا پیدا کرنا، ان کی پرورش کرنا، ان کی ضروریات کو پورا کرنا، اور ہر ایک طرح سے ان کی خبر گیری فرمانا، اس لیے ربوبیت کا مفہوم اس بات کا مقتضی ہے کہ اس کی قدرت کامل ہو، اس کا علم وسیع اور محیط ہو، وہ اپنی مخلوق کی ضروریات سے واقف ہو، اور اس کی رحمت اور احسان کی کوئی انتہا نہ ہو۔

ملک کی تفسیر:

لفظ ملک الناس میں ملک یعنی بادشاہ کا لفظ الناس کی طرف مضاف کیا گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ تمام لوگ اس کے تابع فرمان بندے ہیں اور وہ جس طرح چاہتا ہے ان میں تصرف کرتا ہے۔ کوئی اس کی قدرت کاملہ کے دائرہ سے باہر نہیں اور ہر ایک طرح سے اس کو ان پر تسلط حاصل ہے، وہ اُن کا سچا بادشاہ ہے جس کی طرف وہ ہر ایک تکلیف اور مصیبت کے پیش آنے پر رجوع کرتے ہیں اور ان کے تمام امور کلیہ اور جزئیہ کا انصرام اسی کے ہاتھ میں ہے۔

الٰہ کی تفسیر:

لفظ الٰہ الناس میں الٰہ یعنی معبود کا لفظ الناس کی طرف مضاف بنایا گیا ہے۔ جس کا ملخص یہ ہے کہ وہی ان کا سچا معبود ہے۔ اس طرح اس کی ربوبیت اور اس کی بادشاہت میں کوئی بھی شریک نہیں۔ اسی طرح صرف وہی عبادت کا مستحق ہے اور اس کی عبادت میں بھی کسی کو شرکت کا حق حاصل نہیں۔

قرآن کا اسلوب:

قرآن کریم کا اسلوب کلام یہی ہے کہ جا بجا مشرکوں کو اپنی ربوبیت اور اپنی بادشاہت

کا قائل کر کے اس سے اپنی الوہیت اور معبودیت کے استحقاق پر استدلال فرماتا ہے، جس میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک بنا رکھے ہیں۔ ❶

خلاصہ کلام:

جب یہ ثابت ہوا کہ وہی ہمارا رب ہے، وہی ہمارا بادشاہ اور وہی ہمارا معبود ہے تو ان باتوں کو مان کر ہمیں چاہیے کہ مصائب اور تکلیف میں اسی کی طرف رجوع کریں، اسی کو اپنی اعانت کے لیے پکاریں اور اسی کے ساتھ اپنی بیم وامید کو وابستہ رکھیں، اسی کی محبت سے ہمارے دل بھرپور ہوں، اور اسی پر ہمارا بھروسہ اور توکل ہو، اس کے بغیر کسی دوسرے کے سامنے اپنا سر نیاز نہ جھکائیں اور کسی دوسرے کی بارگاہ میں طلب حاجات کے لیے نہ گڑگڑائیں۔

کیوں کہ وہی ہمارا رب اور ہمارے تمام امور کا والی ہے، ہم اس کے مملوک بندے ہیں اور وہی ہمارا سچا بادشاہ ہے جس کے ہاتھ میں ہمارے تمام مطالبات کی کنجی ہے، وہی ہمارا سچا معبود ہے جس سے ہم ایک لمحہ بھر بے نیاز نہیں ہو سکتے، جس کی طرف ہمارا احتیاج اس سے بہت زیادہ ہے جتنا کہ ہم اپنی روح اور اپنی زندگی کے محتاج ہیں، اس لیے ہم سب کے لیے لازم ہے کہ ہر وقت اسی کی بارگاہ کبریائی میں اپنی جبین نیاز زمین پر رگڑیں اور مصائب و شدائد کے وقت اسی کے آگے دست التجا پھیلائیں، ہماری تمام احتیاجوں کو وہی رفع فرما سکتا ہے اور فرمائے گا اور ہر ایک قسم کی مشکل وہی آسان کر سکتا ہے اور کرے گا۔ اس تمام تقریر سے تمہیں شیطان کے شر سے پناہ مانگنے کے لیے جو انسان کا شدید ترین دشمن ہے، ان اسمائے حسنیٰ اور صفات علیا کی وجہ مناسبت معلوم ہو گئی ہو گی۔

جامعیت ثلاثہ:

اس مسلسل عبارت میں لفظ الناس کو جو ان اسمائے حسنیٰ کا مضاف الیہ ہے۔ بار بار دہرایا گیا ہے اور ضمیر پر اکتفا نہیں کیا گیا۔

---

❶ ورنہ ربوبیت اور بادشاہت میں تو وہ بھی وحدہ لاشریک مانتے ہیں۔ مترجم

اس میں یہ نکتہ ہے کہ مخاطب کو صراحتاً معلوم ہو جائے کہ ربوبیت، بادشاہت اور معبودیت تینوں مستقل صفات ہیں اور تینوں کے مفہوم کو الگ الگ ذہنوں میں رکھنا چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی کا صفحہ دل پر گہرا نقش آجائے۔

ان الفاظ کی ترتیب میں ایک نہایت دلچسپ نکتہ ملحوظ رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ربوبیت کی صفت کو اپنے عموم کی وجہ سے مقدم رکھا گیا ہے اور چونکہ مخلوق کو پیدا کرنے اور ان کی خبر گیری کرنے کے بعد ان میں تصرف کرنے اور اپنے امرونہی کو اس میں نافذ کرنے کی باری آتی ہے اور نافذ الامر بادشاہ ہونا ربوبیت کے سادہ مفہوم کی تکمیل ہے، اس لیے ترتیب طبعی کے مطابق ملک کے لفظ کو دوسری جگہ رکھنا مناسب تھا، اسی طرح بادشاہت کا کمال الوہیت میں ہے اور الوہیت کا مفہوم ان تینوں صفات میں خاص تر واقع ہوا ہے کیونکہ ہر ایک مالک اور بادشاہ معبود نہیں ہوتا۔ اس لیے اس کا سب سے پیچھے ذکر کرنا موزوں تھا۔

علاوہ اس کے یہ تینوں اسماء بلحاظ جامعیت معنی کے تمام اسمائے حسنیٰ کے معانی پر مشتمل ہیں۔

رب الناس کا مفہوم:

رب الناس کا لفظ اپنے وسیع مفہوم میں مندرجہ ذیل اسمائے حسنیٰ کے معانی کو لیے ہوئے ہے۔

(۱) اَلْقَادِرُ. قدرت رکھنے والا

(۲) اَلْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ. پیدا کرنے والا، خدوخال بنانے والا اور تصویر کھینچنے والا

(۳) اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ. وہ زندہ برقرار جس کی ذات پاک کے ساتھ سب مخلوقات کا قیام ہے اور وہ ان کا قیوم ہے

(۴) اَلْعَلِیْمُ. جاننے والا

(۵) اَلسَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ. سننے والا اور دیکھنے والا

(۶) اَلْمُحْسِنُ الْمُنْعِمُ. احسان کرنے والا اور نعمتیں دینے والا

(۷) اَلْجَوَّادُ. نہایت سخی اور فیاض

(۸) اَلْمُعْطِی الْمَانِعُ. اپنے قانون حکمت کے مطابق دینے اور روکنے والا

(۹) اَلضَّارُ النَّافِعُ . نفع وضرر پہنچانے والا

(۱۰) اَلْمُقَدِّمُ الْمُؤَخِّرُ . کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے کرنے والا.

جس کو چاہتا ہے اپنے قانون حکمت کے مطابق ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہے گمراہی میں چھوڑتا ہے، کسی کو سعادت بخشتا ہے اور کسی کو متقی بناتا ہے، عزت اور ذلت اپنی مشیت کے موافق دیتا ہے اور اس کے یہ تمام تصرفات قانون حکمت کے مطابق ہوتے ہیں۔

ملک الناس کا مفہوم:

مَلِكِ النَّاسِ کو وسیع ترین معنوں میں لیا جائے تو ذیل کے اسمائے حسنیٰ کا مفہوم اس کے ضمن میں آجاتا ہے۔ (۱) اَلْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ غالب اپنے زبردست قانون قدرت کے اتباع پر تمام مخلوقات کو مجبور کرنے والا، عظمت اور کبریائی والا (۲) اَلْحَكَمُ الْعَدْلُ حکومت کرنے والا با انصاف (۳) اَلْخَافِضُ الرَّافِعُ کسی کو (حسب استحقاق) نیچے پھینکنے والا اور کسی کے درجات بلند کرنے والا۔ (۴) اَلْمُعِزُّ الْمُذِلُّ عزت اور ذلت دینے والا۔ (۵) اَلْعَظِيْمُ الْجَلِيْلُ الْكَبِيْرُ عظمت اور جلال اور کبریائی والا۔ (۶) اَلْوَالِي الْمُتَعَالِي بڑی شان والا۔ حاکم متصرف (۷) مَلِكُ الْمُلْكُ تمام بادشاہت کا مالک وغیرہ وغیرہ۔

الٰہ الناس کا مفہوم:

الٰہ الناس کا لفظ تو تمام اسمائے حسنیٰ کے معانی پر مشتمل ہے کیونکہ اس کا مفہوم (معبود برحق) تمام صفات کمال کا جامع ہے۔ چناں چہ لفظ الٰہ کے اشتقاق کے متعلق سیبویہ اور دیگر نحاۃ کا یہ قول بالکل درست ہے کہ یہ دراصل الالٰہ تھا۔ ادغام کے بعد اللہ ہو گیا اور نیز یہ کہ اللہ اسم ذات ہے اور اس لیے وہ تمام اسمائے حسنیٰ کے معانی پر جو اسمائے صفات ہیں مشتمل سمجھا جاتا ہے۔ الغرض چونکہ یہ تینوں اسماء تمام اسمائے حسنیٰ کے معانی کو اپنے ضمن میں لیے ہوئے ہیں، اس لیے جو شخص شیطان کے شر سے ان کے ساتھ پناہ طلب کرے گا وہ مستحق ہے کہ اسے شیطان کے شر سے پناہ دی جائے اور وہ اس کے وسوسہ سے محفوظ رہے۔

فصل دوم

سورۂ فلق اور سورۂ ناس کا مقابلہ!

دنیاوی شرور:

سورۂ فلق میں ان شرور سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے جو خارج سے انسان کو پیش آتے ہیں اور سورۂ ناس میں اس شرعظیم کا ذکر ہے جو خود انسان کے اندر موجود ہے اور جس سے بچنا خود اس کی اپنی قوت مدافعت پر منحصر ہے، دنیا میں شر کی دو ہی بڑی بڑی قسمیں ہیں، ایک ذنوب اور معاصی کا شر۔ دوسرا مصائب اور تکالیف کا شر۔ پہلی صورت میں مؤخرالذکر قسم کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے اور دوسری صورت میں اول الذکر قسم کے شر سے پناہ طلب کی گئی ہے جس کا اصل ہمیشہ شیطان کا وسوسہ ہوتا ہے، لیکن انسان کو اس کے اثرات روکنے کا اصل اختیار حاصل ہے اور آدمی اس پر غالب آسکتا ہے۔

فصل سوم

وسواس کی تفسیر

لفظی و اصلاحی معنی:

وسوسہ کے اصلی معنی ہیں، آہستہ سے کوئی بات کہنا جس کا دوسرے حاضرین کو احساس نہ ہو۔ اصطلاح میں اس کے معنی ہیں شیطان کا کسی کے دل میں برائی کا خیال ڈالنا، اس قسم کے مصدر میں عموماً تکرار کے معنی ہوتے ہیں اور شیطان کے القاء کو اس واسطے وسوسہ کہنا مناسب ہے کہ وہ بھی بار بار القاء کرتا ہے۔

وسواس کے لفظ میں نحویوں کا اختلاف ہے [1] کہ وہ مصدر ہے یا صفت۔

---

[1] ہر ایک فریق نے اپنے قول کی ترجیح میں لمبے چوڑے استدلالات کیے ہیں جس کا بیان کرنا عام ناظرین کے لیے دلچسپی کا موجب نہ ہونے کے علاوہ ان کی سمجھ سے بھی کسی قدر بالاتر ہوگا اس لیے ان مباحث کا حذف کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوا۔ مترجم

لیکن راجح قول یہ ہے کہ وسواس اسم صفت ہے، جس کے معنی ہیں وسوسہ ڈالنے والا، اور اس سے مراد شیطان ہے۔

شیطان کا وسوسہ تمام گناہوں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کی جڑ ہے اور شیطان کا وسوسہ ایک ایسا شر ہے جس کا سبب خود انسان کے اندر موجود ہے اور اس کا تعلق انسان کے کسب اور اختیار سے ہے اور اس لیے اس سے بچنے کا وہ خود ذمہ دار ہے کیونکہ شیطان کا وسوسہ اس وقت تک کچھ بھی شر نہیں پیدا کرتا جب تک آدمی خود اس کو قبول نہ کرے اور اس پر عمل پیرا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ ابراہیم میں ہماری تنبیہ کے لیے شیطان کا ایک مکالمہ نقل فرمایا ہے جو قیامت کے روز وقوع میں آئے گا۔ اس میں ایک آیت یہ ہے:

﴿وَ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَ لُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ.﴾ (ابراهيم:١٤/٢٢)

"(شیطان کا قول ہے) اور مجھ کو تم لوگوں پر کسی قسم کا ذرہ بھر تسلط نہیں تھا۔ میرا کام صرف اتنا تھا کہ میں نے تم کو بلایا اور تم نے اس کو قبول کر لیا تم مجھ کو ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔"

فصل چہارم

الخناس کی تفسیر

خناس کے معنی:

خناس کا اشتقاق خَنَسٌ ہے جس کے معنی ہیں ظہور میں آنے کے بعد چھپ جانا اور پیچھے ہٹ جانا۔ قرآن میں ہے:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ.﴾ (التكوير:٨١/١٥)

"میں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو ظہور میں آنے کے بعد چھپ جاتے ہیں۔"

بعض مفسرین نے دوسرے معنی لے کر اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ ستارے جو آگے

بڑھتے بڑھتے پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ الغرض اس مادہ میں یہ دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔خناس مبالغے کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت چھپ جانے والا اور بہت پیچھے ہٹ جانے والا۔ یہ شیطانِ وسواس کی صفت ہے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے تو شیطان اس کے قلب پر چھا جاتا ہے اور اس کے دل میں قسم قسم کے وسوسے ڈالتا ہے جو مختلف گناہوں کے ارتکاب کا بیج ہوتا ہے لیکن جب انسان اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہو جائے اور اس کے ساتھ شیطان کے شر سے پناہ لے تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور ظاہر ہونے کے بعد پھر چھپ جاتا ہے۔

قتادہ رحمہ اللہ نے تمثیلی پیرائے میں اس کو اس طرح بیان کیا ہے کہ شیطان اپنی کتے جیسی تھوتھنی آدمی کے قلب پر رکھے رہتا ہے لیکن جب آدمی اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہو تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اپنے اڈے کو چھوڑ دیتا ہے۔اسی طرح بعض بزرگوں نے اس کو سانپ کے سرے سے تشبیہ دی ہے۔ پہلی تشبیہ تحقیر کے لیے ہے اور دوسری میں اس کے زہریلے اثرات کی طرف اشارہ ہے۔مبالغے کا صیغہ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ وہ بار بار ایسا کرتا ہے یعنی ذرا سا موقع اس کو ملا اور اس نے وسوسہ ڈالنا شروع کیا لیکن جونہی آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا اور وہ پیچھے ہٹ گیا۔ وھکذا الی غیر النھایة

بہر کیف اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور اس کی یاد میں مشغول ہونا شیطان کے ہٹانے کے لیے کوڑے کا کام دیتا ہے اور آہنی گرز کی ضرب سے بڑھ کر اس کو تکلیف دیتا ہے اس لیے بعض بزرگوں نے یہ کنایہ استعمال کیا ہے کہ مؤمن کا شیطان لاغر اور درماندہ ہوتا ہے کیونکہ مؤمن شخص ہمیشہ اپنے شیطان کو ذکر اللہ کے کوڑے لگاتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت اور توبہ و استغفار میں مشغول رہ کر اس کو لاغر اور کمزور بنا دینے میں کوتاہی نہیں کرتا اور اس کا شیطان ہمیشہ تکلیف میں رہتا ہے، برخلاف اس کے فاسق فاجر آدمی کا شیطان موٹا تازہ رہتا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو چھوڑ کر شیطان کی اطاعت میں مصروف رہتا ہے اور اس کو ناراض ہونے کا موقع نہیں دیتا۔لیکن یہ یاد رکھو کہ جو شخص اس دنیاوی زندگی میں اپنے

شیطان کو ذلیل اور معذب نہیں رکھے گا تو آخرت میں شیطان اس کے عذاب کا باعث ہوگا اور اس کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا۔

فصل پنجم

تفسیر الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ

شیطانی وسوسہ:

﴿ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ﴾

''وہ شیطان جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا رہتا ہے۔''

پہلی آیت میں وسوسہ ڈالنے والے کا ذکر تھا اور اس آیت میں وسوسہ کی جگہ بتائی گئی ہے۔

شیطان کا نفوذ:

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو یہ قدرت بخشی ہے کہ وہ انسان کے سینے میں داخل ہو اور اس کے دل میں فاسد خیالات پیدا کرے (جس کا دوسرا نام وسوسہ ہے) وہ اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے رہتا ہے اور موت کے وقت تک اس سے جدا نہیں ہوتا۔

دلائل نفوذ شیطان:

آنحضرت ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ مسجد میں اعتکاف کیے ہوئے تھے۔ رات کے وقت میں آپ ﷺ کی نیاز حاصل کرنے کے لیے خدمت میں حاضر ہوئی تھوڑی دیر تک بات چیت کرنے کے بعد میں واپس آنے لگی تو آپ مجھے رخصت کرنے کے لیے تھوڑی دور میرے ساتھ چلے (حضرت صفیہ کا گھر اسامہ بن زید کی حویلی میں تھا) اس اثناء میں انصار کے دو آدمی سامنے سے گزرے اور انہوں نے آپ کو پہچانا تو تیزی سے آگے نکل گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو آواز دے کر فرمایا، ذرا ٹھہر جاؤ، یہ میری اپنی بیوی صفیہ رضی اللہ عنہا ہے انہوں نے آپ کی اس غیر ضروری صفائی پیش کرنے پر تعجب کیا اور کہا سبحان اللہ! یا رسول اللہ! (یعنی آپ کے متعلق بھی کسی قسم کا شبہ ہو سکتا ہے؟) آپ نے فرمایا:

"بے شک شیطان انسان کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح سرایت کر جاتا ہے اور مجھے خوف تھا کہ کہیں تمہارے دل میں کوئی شک پیدا کر دے۔"[1]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب نماز کے لیے اذان ہونے لگتی ہے تو شیطان گوز لگاتا ہوا پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے۔ جب اذان ختم ہوتی ہے تو پھر نمازیوں کے ورغلانے کے لیے متوجہ ہوتا ہے۔جب اقامت شروع ہوتی ہے تو پھر پسپا ہونے لگتا ہے۔ اقامت سے جب فراغت ہوتی ہے تو پھر آموجود ہوتا ہے اور آدمی کے دل میں وسوسے ڈالنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور بھولی بسری باتیں اس کو یاد دلاتا ہے یہاں تک کہ نمازی نہیں جانتا کہ میں نے تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار۔ ایسی حالت میں سجدۂ سہو کرنا چاہیے۔"[2]

وسوسہ کی قسمیں:

اسی وسوسہ کی ایک قسم وہ ہے جس کا ذکر اس حدیث میں ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے: "تم میں سے کسی کے پاس شیطان آجاتا ہے تو یہ وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے کہ فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا اور فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا۔ یہاں تک کہ وہ کہہ دیتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا۔ جو کوئی تم میں سے اپنے دل میں یہ وسوسہ پائے اس کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پناہ مانگے اور اپنے خیال کو زیادہ دوڑانے سے باز آجائے۔"[3]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاعتکاف، باب هل یخرج المعتکف لحوائجه، رقم:۲۰۳۵۔ صحیح مسلم، کتاب السلام، باب بیان انه یستحب لمن رؤی خالیا بامراة، رقم:۲٤/۲۱۷۵۔ سنن ابو داؤد، کتاب الصوم، باب المعتکف یدخل البیت لحاجته، رقم:۲٤۷۰

[2] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب اذا لم یدر کم صلی، رقم:۱۲۳۱۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاة، باب فضل الاذان وهرب الشیطان عند سماعه، رقم:۱۹/۳۸۹

[3] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب صفة ابلیس و جنوده، رقم:۳۲۷٦۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسة فی الایمان، رقم:۲۱٤/۱۳٤

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم اپنے دل میں بعض اوقات ایسا خیال پاتے ہیں کہ اگر ہم آسمان سے گر کر ہلاک ہو جائیں تو اس بات کو ہم اس بات پر ترجیح دیں گے کہ اس خیال کو زبان پر لائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، خدا کا شکر ہے کہ اس نے شیطان کی سازشوں اور بد اندیشیوں کو وسوسہ تک محدود رکھا (یعنی اس پر مواخذہ نہیں)❶

یہ بھی وسوسہ کی ایک قسم ہے کہ انسان کوئی نیکی کا کام کرنا چاہتا ہے اور شیطان اس کو دوسرے خیالات میں یہاں تک لگائے رکھتا ہے کہ وہ اس نیکی کا کرنا بھول جاتا ہے۔ اسی بناء پر نسیان اور فراموشی کی نسبت شیطان کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وہی اس کا باعث ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے قصے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شاگرد حضرت یوشع بن نون کا قول منقول ہے:

﴿فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ ۛ وَمَآ أَنسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَٰنُ أَنْ أَذْكُرَهُ﴾

(الکھف:۱۸/۶۳)

”میں مچھلی کی بابت ذکر کرنا بھول گیا اور شیطان ہی نے اس کا ذکر بھلا دیا۔“

شیطان کا سب سے بڑا شر:

آیت زیر تفسیر میں شر کی اضافت شیطان کی طرف کی گئی ہے اور اگرچہ اس کا ایک عظیم شر اس کا وسوسہ ڈالنا ہے۔ تاہم یہ نہیں کہا کہ من شر وسوسة بلکہ کہا ہے:

﴿مِن شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ.﴾

اس میں نکتہ یہ ہے کہ استعاذہ اس کے تمام شرور پر مشتمل ہو البتہ اس میں شک نہیں کہ اس کا عظیم ترین شر جس کے زبردست اثر سے بڑے سے بڑا آدمی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہی وسوسہ ہے جو انسانی ارادہ کے گناہ اور معصیت پر مائل کرنے کی جز اور ہر ایک قسم کے اعمال فاسدہ کے ظہور میں آنے کا ابتدائی بیج ہے۔

---

❶ شعب الایمان للبیہقی (۲/۱۷۳، ۱۷۴) رقم: ۳۳۴، ۳۳۵

شیطان کا طرزِ عمل:

انسان کا آئینہ دل ہر ایک قسم کے شر اور معصیت کے خیال سے صاف ہوتا ہے۔ شیطان اپنے وسوسہ کے ذریعہ سے اس کے صفحۂ دل ❶ پر گناہ کی ایک تصویر قائم کر دیتا ہے جس کو آراستہ کرنے اور مزین بنانے پر وہ اپنی ہنرمندی صرف کرتا ہے اور بالآخر اس کو انسان کے سامنے ایک دلکش شکل میں پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں اس گناہ کے کرنے کا خیال راسخ ہوکر ارادہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور شیطان اس کے مضر اثرات اور اس کے انجام بد اور اس کی عقوبت کو اس کی چشم بصیرت سے اوجھل کر دیتا ہے چنانچہ اس کو صرف گناہ کی صورت اور اس کی لذت نظر آتی ہے اور بس۔ اس حالت میں شیطان اس کے دل میں حرص اور شہوت کے لشکر کو حرکت دیتا ہے اور اس کو گناہ کے ارتکاب پر آمادہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتا۔ اس کے بعد جو کچھ وقوع میں آتا ہے وہ تم نے خود اپنے آپ میں اور دوسروں میں مشاہدہ کیا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا.﴾ (مریم: ۱۹/۸۳)

”کیا تم نے اس بات کو مشاہدہ نہیں کیا کہ ہم شیطانوں کو کافروں کے مقابلہ میں (ان کو گمراہ کرنے کے لیے کیوں کہ وہ خود ان کا اثر قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتے ہیں) چھوڑ دیتے ہیں ❷ اور وہ شیطان ان کو اچھی جنبش دیتے ہیں۔“ ❸

الغرض وہ اس طرح انسان سے گناہ کرا کے چھوڑتا ہے۔ ہر ایک گناہ اور معصیت کی جڑ اسی کا وسوسہ ہے اور اسی نکتہ کے لیے آیت کریمہ میں اس کے شر سے استعاذہ کی تعلیم دیتے ہوئے اس کو وسواس (وسوسہ ڈالنے والا) کے لفظ سے موصوف کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہی اس کی ممتاز صفت ہے۔

---

❶ زمانہ حال کی اصطلاح فوٹو گرافی کے لوازم کو ملحوظ رکھ کر یہ کہنا چاہیے کہ اس کے دل کے پلیٹ پر۔

❷ اس تعبیر میں یہ نکتہ ہے کہ شیطان کی مثال ایک کتے کی ہے جس کو دشمن پر چھوڑ دیا جائے

❸ ان کے قوائے شہوانی کو تیز اور ارتکاب گناہ کے بارے میں ان کی سستی کو دور کرتے ہیں۔ مترجم

فصل ششم

شیطان کے دوسرے شر

اقسام:

اس کے علاوہ اور بھی اس سے کئی قسم کے شر صادر ہوتے ہیں جن سے پناہ مانگنا لازم تھا اس لیے شر کو اس کی ذات کی طرف مضاف کیا گیا ہے تاکہ استعاذہ اس کے تمام شرور پر مشتمل ہو، وسوسہ کو چھوڑ کر اس کے دوسرے شرور بھی ہیں۔

(۱) وہ چور ہے اور لوگوں کے مال چوری کرتا ہے۔ جس کھانے یا پینے کی چیز پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ ذکر کیا جائے اس سے اپنا حصہ چرا لینے میں وہ کامیاب ہوتا ہے، اسی طرح جس گھر میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے لوگ غافل ہوں وہ اس گھر میں شب باش ہوتا ہے۔

(۲) ایک شر اس کا یہ ہے کہ جس کے دل میں وسوسہ ڈال کر اس سے گناہ کراتا ہے۔ پھر خود ہی اس کا پردہ فاش کر کے لوگوں میں اس کو فضیحت کرتا اور انگشت نما بناتا ہے۔ بسا اوقات ایک شخص پوشیدہ طور پر گناہ کا ارتکاب کرتا ہے جس سے کوئی بھی آگاہ نہیں ہوتا۔ لیکن وہ دیکھتا ہے کہ دوسرے دن اس کی خبر چاروں طرف پھیل گئی ہے اور لوگوں کا موضوع سخن اسی کا گناہ ہے۔ یہ تمام شیطان کی کارستانی ہوتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ستار ہے اپنے بندوں کے گناہوں اور اس کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے لیکن شیطان جو اس کا دشمن ہے اس کو فضیحت کرنا چاہتا ہے، بہت سے لوگ اس نکتہ سے بے خبر ہیں۔

تہجد سے باز رکھنا:

(۳) شیطان کا ایک شر یہ ہے کہ جب انسان سوجاتا ہے تو وہ اس کی گدی پر تین گرہیں لگا دیتا ہے جو اس کے لیے تہجد کے واسطے اٹھنے سے مانع ہوتی ہیں۔ صحیح بخاری میں بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

”جب تم میں سے کوئی سوجاتا ہے تو شیطان اس کی گدی پر تین گرہیں لگا دیتا

ہے۔ ہر ایک گرہ میں یہ منتر پھونک دیتا ہے کہ ابھی کیا اٹھتے ہو بہت رات باقی ہے، سو جاؤ۔ لیکن اگر آدمی اس کے کہنے پر التفات نہ کر کے اٹھ بیٹھے اور خدا کو یاد کر لے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے پھر اگر اس نے وضو بھی کر لیا تو دوسری کھل جاتی ہے اور اگر نماز بھی پڑھ لی تو اس کی تمام گرہیں کھل جاتی ہیں اور صبح کو اس کے اعضاء چست اور اس کی طبیعت خوش ہوتی ہے، بصورت دیگر اس کی طبیعت پریشان اور اس کے اعضاء سست ہوتے ہیں۔''[1]

ایک صحیح حدیث کا مفہوم یہ بھی ہے کہ جو شخص ساری رات سوتا رہے۔ اس کے کان میں شیطان نے پیشاب کیا ہوتا ہے۔[2]

نیکی کے کام سے روکنا:

(۴) شیطان کا ایک شر یہ بھی ہے کہ انسان کوئی نیکی کا کام کرنا چاہے تو وہ اس کا راستہ روکتا اور اس کو نیکی سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔[3] دنیا میں جتنی بھی نیکیاں ہیں ہر ایک نیکی کے راستہ پر شیطان بیٹھا راستہ روک رہا ہے اور اس کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس راستہ پر کوئی نہ چلے اور اگر کوئی اس کی مخالفت کر کے چل پڑے تو وہ قاطع الطریق (رہزن) کی طرح اس کو تشویش میں ڈال کر اور ہر قسم کے موانع اس کے سامنے لا کر اس کو آخر تک پہنچنے نہیں دیتا لیکن اگر کوئی خوش قسمت اور باہمت انسان نیکی کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کو ایسی باتوں پر آمادہ کرنے میں کوشاں رہتا ہے جس سے اس کا وہ عمل صالح برباد ہو جائے۔[4]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التهجد، باب عقد الشيطان على قافية الراس، رقم:۱۱٤۲۔ صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرين، باب الحث على صلاة الليل، رقم:۲۰۷/۷۷٦

[2] صحیح بخاری، کتاب التهجد، باب اذا نام ولم يصل بال الشيطان فی اذنه، رقم:۱۱٤٤

[3] مسنداحمد(۴۸۳/۳) رقم: ۱٥۹٥۸

[4] مثلاً اثنائے عمل میں ریا اور نمود اور اس کے ہو چکنے کے بعد عجب اور خود پسندی عمل کے ثواب کو ضائع کر دیتی ہے یا جیسے صدقہ کے لیے احسان جتلانا اور ایذاء دینا اس کے اجر کو برباد کرنے کا موجب ہے۔ مترجم

کلام مجید میں شیطان کا قول ہے:

﴿ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ۙ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ اَيْمَانِهِمْ وَ عَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴾ (الاعراف:۷/۱۶۔۱۷)

''یقیناً میں ان کو گمراہ کرنے کے لیے تیرے صراط مستقیم پر بیٹھ جاؤں گا اور پھر میں ان کا راستہ روکنے کے لیے ان کے آگے کی طرف سے اور ان کے پیچھے کی طرف سے اور ان کے دائیں اور بائیں جانب سے آ کر اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی کوشش کروں گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تو ان میں سے اکثروں کو ناشکر گزار پائے گا۔''

اسی نے ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا اور اسی نے ہر ایک نبی علیہ السلام کے زمانہ میں یہ کوشش کی کہ اس کی دعوت الی اللہ کامیاب نہ ہو۔

شیطان اپنی پرستش چاہتا ہے:

(۵) وہ چاہتا ہے کہ خدا کی توحید اور عبادت دنیا سے مٹ جائے اور جا بجا چہار دانگ عالم میں اس (شیطان) کی دعوت کا بول بالا ہو اور لوگ اپنے معبود برحق کو چھوڑ کر اس کی پرستش میں مشغول ہو جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈلوانا:

(۶) یہ اسی کی کارستانی تھی کہ اہل بابل کو اس پر آمادہ کیا کہ رئیس الموحدین ابو الانبیاء حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام کو آگ میں پھینکیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو ان کے شر سے بچایا۔ قرآن مجید میں مذکور ہے:

﴿ يٰنَارُ كُونِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرَاهِيْمَ. ﴾ (الانبیاء:۲۱/۶۹)

''اے آگ! ابراہیم کے حق میں ٹھنڈی اور سلامتی کا موجب ہو جا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھانا:

(۷) اس نے یہودیوں کو ورغلایا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر چڑھانے کے لیے جد جہد کریں۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ان کی حمایت کی اور کافروں کے شر سے انہیں محفوظ رکھا۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ. ﴾ (النساء:۴/۱۵۷)

''انہوں نے اس کو قتل کیا اور نہ اس کو صلیب دینے میں کامیاب ہوئے بلکہ ایک شبہ میں ڈال دیے گئے۔''

حضرت یحیٰ علیہ السلام کی شہادت:

(۸) شیطان ہی کے کرتوت تھے کہ حضرت یحیٰ اور زکریا علیہما السلام کو کافروں کے ہاتھ سے شہید کرایا۔ فرعون کو خدائی کا دعویٰ کرنے، ملک میں سخت فساد پھیلانے اور غریبوں پر مظالم ڈھانے پر آمادہ کیا اور ہمارے نبی کریم افضل الصلاۃ والتسلیم کے برخلاف کافروں کو اکسایا کہ ان کے قتل کی سازش کریں اور ان کی رسالت کو ناکامیاب بنانے کے لیے ان کے ساتھ لڑائیاں لڑیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں ورغلانا:

(۹) ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ وہ آگ کا ایک شعلہ لے کر سامنے سے نمودار ہوا اور قریب تھا کہ آپ کو اس سے گزند پہنچے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ پناہ لی اور اس پر خدا کی لعنت بھیجی جس پر وہ بھاگ گیا۔ [1]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ، باب الاسیر او الغریم یربط فی المسجد، رقم:۴۶۱۔صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب جواز لعن الشیطان فی اثناء الصلاۃ، رقم:۵۴۱/۳۹۔مسنداحمد(۲/۲۹۸)رقم:۷۹۶۹

رسول کریم پر جادو کرنا:

(۱۰) اسی طرح یہودیوں کو ورغلایا اور انہوں نے آپ ﷺ پر جادو کیا۔ جس کا ذکر پہلے مفصل ہو چکا ہے۔

الغرض جب اس کی یہ حالت تھی کہ وہ انبیاء علیہم السلام تک سے نہیں چوکتا اور سید الانبیاء ﷺ کو نماز کی حالت میں چھیڑا تو اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ اس کے شر سے مخلصی پانا کس قدر دشوار ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کا فضل شامل نہ ہو تو معاملہ نہایت سخت ہے۔

﴿ وَ لَوۡ لَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَ رَحۡمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنۡكُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّ لٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۝ ﴾ (النور: ۲۴/۲۱)

''اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی عنایت تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو کوئی بھی تم میں سے ہرگز اس کے شر سے مخلصی پا کر پاکیزہ نہ بنتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنے قانون حکمت کے مطابق پاکیزہ بناتا اور اس کے شر سے محفوظ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔''

فصل ہفتم

شیطانی شر کے اقسام

چھ قسمیں:

اگرچہ ہر ایک قسم کا شر جو دنیا میں موجود ہے اس کی ابتداء شیطان سے ہے اور اس لیے شر کی قسموں کا شمار کرنا قدرے دشوار ہے۔ لیکن اس کی بڑی بڑی چھ قسمیں ہیں اور وہ ہمیشہ انسان کو انہیں میں سے کسی ایک میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی تفصیل ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

شرک وکفر:

(۱) سب سے بڑا شرک وکفر ہے جس کا نتیجہ اللہ اور رسول کی دشمنی ہوتی ہے اور جس کی

عقوبت آخرت میں ابدی جہنم ہے۔ شیطان سب سے پہلے انسان کو اسی میں مبتلا کرنا چاہتا ہے اور اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائے تو گویا اس کے دل کی مراد پوری ہو جاتی ہے، کیونکہ ایسا شخص (العیاذ باللہ) ابلیس کا داعی اور اس کا نائب بن جاتا ہے۔

بدعت:

(۲) لیکن اگر وہ پہلی قسم میں کامیاب نہ ہو تو پھر وہ آدمی کو بدعت کی طرف بلاتا ہے اور اس کو وہ فسق و فجور پر ترجیح دیتا ہے کیونکہ اول الذکر کا تعلق اعتقاد سے ہے اور مؤخر الذکر عمل کی خرابی ہے۔ علاوہ ازیں کھلے گناہ پر اکثر انسان کا اپنا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، اس لیے وہ عموماً توبہ پر مائل ہو جاتا ہے لیکن چوں کہ آدمی اپنے زعم میں بدعت کو برا سمجھتا ہی نہیں بلکہ یہ خیال کرتا ہے کہ میں ایک اچھا کام کر رہا ہوں اس لیے وہ اس سے تائب نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے تائب ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔

بدعت کی بنا من حیث یدری او لا یدری مخالفت رسول پر ہے اس لیے اس کا درجہ شرک و کفر کے قریب قریب ہے، لہٰذا بدعت کی طرف بلانا شیطان لعین کا مرغوب مشغلہ ہے اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ میں نے اپنے نائبوں کی تعداد میں ایک اور کا اضافہ کر دیا۔ بلحاظ شر کے مبتدع بھی کافر اور مشرک سے کچھ کم نہیں بلکہ بعض اوقات ان کا شر ان سے بڑھ کر خرابی پیدا کرتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسلام کا دوست نما دشمن ہے اور اس کا بدعت کی طرف بلانا شہد میں زہر ملا کر دینے کی مثال رکھتا ہے۔

کبائر:

(۳) لیکن اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے سنت پر ثابت قدم رہنے کی توفیق بخشی ہو اور شیطان کی ملمع کاریاں اس کی تیز بیں اور نقاد نظروں سے چہرہ حقیقت اور جمال سنت چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکتی ہوں۔ پھر اس کا تیسرا داؤ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو کبائر کے ارتکاب پر آمادہ اور اس میں مبتلا کر دے اور اگر وہ شخص عالم ہے اور لوگ اس کو قابل اقتداء سمجھتے ہیں تو شیطان لعین کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کو پھسلا دے تا کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں اور ان

کے فیض صحبت سے جو تھوڑا بہت فائدہ متصور ہوتا تھا اس کا دروازہ بند ہو جائے۔ جب وہ بد قسمتی سے گناہ کر بیٹھتا ہے تو پھر اس (شیطان) کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو لوگوں میں شہرت دے اور طبقہ عوام میں ایسے اشخاص کی کمی نہیں ہوتی جو ابلیس کے نائب بن کر اس عالم کی اس لغزش کو مشہور کرتے پھرتے ہیں اور بزعم خود اس کو ایک ثواب کا کام سمجھتے ہیں، ایسے اشخاص کو میں نے ابلیس کا نائب اس لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ لا فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ. ﴾ (النور:٢٤/١٩)

''جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں کی بری بات مشہور ہو جائے ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔''

اب تم خود سمجھ سکتے ہو کہ جب ان لوگوں کے لیے یہ وعید ہے جو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں کی کوئی بری بات مشہور ہو جائے تو وہ اشخاص کیوں نہ ابلیس کے نائب تصور کیے جائیں جو مومنوں کی بری بات مشہور کرنے میں پیش از پیش رہتے ہیں اور اس کے علمبردار ہوتے ہیں۔ یہ تم یاد رکھو کہ اس عالم مقتدیٰ کا گناہ خواہ کتنا بڑا ہو، ان لوگوں کے گناہ کے مقابلہ میں کم ہوگا کیوں کہ یہ اس کا اپنے نفس پر ظلم ہے جس سے اگر وہ تائب ہو جائے اور خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے اس کی بابت مغفرت طلب کرے [1] تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر کے اپنے سچے وعدے کے مطابق اس کی برائیوں کو نیکیوں کے ساتھ تبدیل کر دے گا لیکن ان لوگوں کے گناہ کی کچھ اور نوعیت ہے کیونکہ یہ بندے پر ظلم ہے اور ایک مسلم بلکہ عالم دین کی عیب جوئی اور اس کی فضیحت کرتا ہے اور گو بظاہر اس عیب جوئی اور ارادۂ فضیحت کو تاویلوں کے زور سے خیر خواہی مسلمانان یا کسی دوسری نیکی کی صورت میں ظاہر کیا جائے لیکن اللہ تعالیٰ سینوں کے راز اور نفس کی پوشیدہ خباثتوں سے واقف ہے۔

---

[1] اور ایک عالم سے اس بات کی توقع رکھنا غیر اغلب نہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ.﴾(آل عمران:۳/۵)

(۴) لیکن اگر شیطان کو اس کوشش میں بھی مایوسی حاصل ہو اور وہ کبیرہ کے ارتکاب پر بھی کسی کو مائل نہ کر سکے تو وہ صغائر کے کرا لینے پر اکتفا کرتا ہے کیونکہ صغائر بھی جمع ہو کر کبیرہ کی طرح انسان کی ہلاکت کا باعث ہو سکتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

''حقیر گناہوں سے اپنے آپ کو بچاؤ، کیونکہ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی قوم بیابان میں اتر پڑے اور ہر ایک ان میں سے جا کر جنگل سے ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھا لائے۔ یہ ٹکڑے جمع کر کے ایک بڑی آگ مشتعل کی جا سکتی ہے۔ جس پر روٹی پکا سکتے اور کباب بھون سکتے ہیں (یہ حدیث بالمعنی روایت کی گئی ہے اور حدیث کے ٹھیک الفاظ راوی کو یاد نہیں رہے)۔'' ❶

صغائر کے ارتکاب میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ مرتکب ان کو بہت ہلکا اور نا قابل اعتناء سمجھ کر ان کا ارتکاب کرتا ہے لیکن کسی کبیرہ گناہ کا کرنے والا جو اپنی عاقبت کی بابت ہراساں ہے اس سے بہت بہتر ہے جو صغائر کو حقیر سمجھ کر ان کا ارتکاب کرتا ہے!

مباحات:

(۵) پانچواں شر شیطان کا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صغائر کا بھی ارتکاب نہیں کرتا ہے تو وہ اس کو ایسے مباحات ❷ میں مشغول کر دیتا ہے۔ جس میں مشغول رہ کر انسان ثواب کے کاموں سے محروم رہتا ہے اور جن کا ثواب باوجود قدرت کے کھو بیٹھنا نقصان عظیم ہے، شیطان کو اس سے بھی خوشی ہوتی ہے کہ وہ کسی ثواب اور درجات کے حاصل کرنے سے محروم کر دے۔ لیکن اگر کوئی صاحب بصیرت شخص اپنے وقت عزیز کا اس قدر خیال رکھتا ہے کہ اس کو مباحات میں بھی

---

❶ الامثال لابی الشیخ، رقم: ۳۲۱

❷ مباحات وہ ہے جن کے کرنے نہ کرنے میں ثواب عذاب نہیں۔ مترجم

ضائع نہیں کرتا اور سمجھتا ہے کہ اس کا ایک ایک لمحہ اگر کسی نیک کام میں صرف کیا جائے تو اس سے ملک ابد کے درجات عالیہ خریدے جا سکتے ہیں تو ایسے شخص کے ساتھ شیطان ایک اور داؤ کھیلتا ہے، اس کی تفصیل نمبر ۶ میں درج ہو رہی ہے۔

افضل عمل سے باز رکھنا:

(۶) اس کو کسی افضل عمل سے باز رکھ کر عمل مفضول ☆ میں مشغول کر دیتا ہے تاکہ ان کو کم از کم ثواب کی زیادتی سے محروم کر دے، یہ ایک ایسا دام فریب ہے کہ جس کا پول اکثروں پر نہیں کھلتا اور بڑے بڑے عابد اس میں گر پڑتے ہیں کیونکہ جب ایک شخص اپنے دل میں کسی نیکی اور کار ثواب کے کرنے کی رغبت پاتا ہے تو اسے گمان تک نہیں ہوتا کہ اس کا محرک اور ترغیب دہندہ شیطان ہے، لیکن حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے اور شیطان اس کو نیکی کرنے کی اس لیے ترغیب دیتا ہے کہ اس کو اس سے بہتر نیکی سے مانع ہو جس کے کرنے سے اس کو بہت زیادہ ثواب حاصل ہو سکتا تھا۔ ❶

عموماً سادہ لوح مؤمن کی سمجھ سے یہ بات بالاتر ہوتی ہے کہ شیطان بھی انسان کو نیکی پر مائل کر سکتا ہے، وہ اس قسم کی تحریک اور خواہش کو من جانب اللہ تعالیٰ خیال کرتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ شیطان لعین بعض اوقات ایک چھوڑ ستر نیکیوں کے کرنے کی ترغیب دیتا ہے جس سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ شخص کسی شر میں مبتلا ہو (اور وہ ستر نیکیاں صرف کسی شر میں مبتلا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہیں) یا کسی نیکی سے اس کو محروم کر دے جو تنہا ان ستر نیکیوں سے زیادہ ثواب اور درجات کا موجب ہے۔

شیطان کی اس دقیق مکاریوں کو وہی شخص پہچان سکتا ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص ہدایت کا نور رکھ دیا ہو جو اس شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جو خالص سنت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا پابند ہو اور بدعت سے سخت اجتناب کرتا ہو اور اس بات کی ٹوہ میں لگا رہے کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور اس کے رسول کی نظر میں زیادہ محبوب ہے لیکن اکثر لوگ اس مرتبہ سے محجوب ہیں:

---

❶ ☆ ایسے عمل میں جو پہلے کے مقابلہ میں کمتر ثواب کا موجب ہے۔ مترجم

﴿ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ. ﴾

الغرض جب شیطان ان تمام شرور میں سے کسی میں بھی آدمی کو مبتلا نہ کر سکے تو پھر وہ اپنی جماعت کے لوگوں انس وجن کو اس کی ایذا اور تکلیف دہی پر آمادہ کرتا ہے یہ لوگ اس کو کافر اور گمراہ اور اسی قسم کے دیگر القاب سے یاد کرتے اور دوسروں کو اس سے متنفر کرتے ہیں جس سے اس لعین کا مطلب اس کو تشویش میں ڈالنا ہوتا ہے، تاکہ اس کے قوائے فکریہ ان کے بیجا اتہامات اور ضرر رسانی کے دفع پر متوجہ ہوں، جتنا وہ اس پر متوجہ ہوگا اتنا وہ خدائے تعالیٰ کی یاد سے غافل ہوگا اور جلیل القدر نیکیوں کے کرنے پر وہ کم توجہ مبذول کر سکے گا۔

علاوہ ازیں دوسرے لوگ جو بصورت دیگر اس کے علم اور اس کے اسوہ حسنہ سے عظیم فوائد حاصل کرتے اور اس کے فیض صحبت سے محروم رہتے ہیں۔

شیطان کی رسائی:

قارئین کرام! یہ ایک عظیم النفع باب ہے۔اس کے مضمون کو اچھی طرح اپنے ذہن میں نقش کرلو:

یوسوس فی قلوب الناس کے بجائے یوسوس فی صدور الناس

کہنے میں یہ نکتہ ہے کہ شیطان کی رسائی اصل دل تک نہیں ہوسکتی بلکہ وہ صرف انسان کے سینے میں جو قلب کے لیے بمنزلہ دہلیز کے ہے داخل ہوکر وسوسہ ڈالنے اور انسان کے ارادہ میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرنے میں کوشش کرتا ہے۔ یہ معلوم کر کے مؤمن کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور وہ اس کے شر کو دفع کرنے پر دلیر ہوتا ہے۔حضرت آدم علیہ السلام کے قصے میں ارشاد ہوا ہے:

﴿ فَوَسْوَسَ اِلَیْهِ الشَّیْطٰنُ ﴾ (طٰه: ۲۰/ ۱۲۰)

''شیطان نے اس کی طرف وسوسہ ڈالا۔''

الـــیٰ کے استعمال کرنے میں بھی یہی نکتہ ہے کہ شیطان نے اپنا وسوسہ کسی قدر دور سے اس کے دل میں ڈالا۔

فصل ہشتم

تفسیر من الجنة والناس!

مفسرین کا اختلاف:

من الجنة والناس کے متعلق مفسروں نے اختلاف کیا ہے، مفسرین کی ایک جماعت کا یہ قول ہے کہ من بیانیہ ہے اور اس کا تعلق لفظ الناس کے ساتھ ہے۔ جو صدور کا مضاف الیہ واقع ہوا ہے۔ اس قول کے موافق آیت کریمہ کے یہ معنی ہیں کہ وسوسہ ڈالنے والا شیطان دو قسم کے لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ جن اور انسان بالفاظ دیگر وہ شیطان جو جنوں کی قوم سے ہے جنیوں کے اور آدمیوں کے سینہ میں برے خیالات کا القا کرتا ہے لیکن یہ قول کئی وجوہ سے ضعیف ہے۔ ❶

(۱) ایک تو یہ کہ لفظ کے لحاظ سے بھی یہ ترکیب درست نہیں کیونکہ اس قول کے بموجب الناس کا بیان الجنة والناس واقع ہوا ہے جس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ شیطان جو لوگوں کے سینہ میں وسوسہ ڈالتا ہے یعنی ''جن اور لوگوں کے سینہ میں'' کیا اس عبارت کو تم فصیح کہہ سکتے ہو؟ ہرگز نہیں۔

(۳) تیسرے یہ کہ اس کے یہ معنی ہوئے کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں: ایک جن اور دوسرے لوگ، اس کی تقسیم بالکل درست نہیں، اس کو کہتے ہیں تقسیم الشیء الی نفسه والیٰ غیرہ ۔اس کے معنی بعینہ یہ ہوئے کہ انسان کی دو قسمیں ہیں: انسان اور غیر انسان مگر کیونکہ جن یقیناً انسان نہیں بلکہ اس کا مد مقابل ہے اور اس کا مادہ اشتقاق بھی یہی ظاہر کرتا ہے۔ ج، ن، ن، کا مادہ جس لفظ میں پایا جائے اس میں پوشیدگی کے معنی ملحوظ ہوں گے اور جن کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ وہ آنکھوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے الناس اور انسان کا مادہ۔ ا، ن، س ہے جس میں دیکھنے کی معنی پائے جاتے ہیں۔

---

❶ یعنی کسی دوسری آیت یا حدیث صحیح میں اس کی تصریح نہیں پائی جاتی۔ مترجم

کلام پاک میں ہے:

﴿ اٰنَسَ مِنۡ جَانِبِ الطُّوۡرِ ﴾ (القصص:۲۸/۲۹)

''کوہ طور کے جانب سے اس کو آگ نظر آئی۔''

﴿ فَاِنۡ اٰنَسۡتُمۡ مِّنۡهُمۡ رُشۡدًا ﴾ (النساء:۴/۶)

''اگر تم دیکھو کہ ان میں معاملہ فہمی کی صفت پیدا ہوگئی ہے۔''

انسان کو اس لیے انسان کہتے ہیں کہ وہ آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا جاتا ہے۔ انسان کو نسیان سے مشتق سمجھنا جیسے کہ بعض کا خیال ہے بالکل غلط ہے۔ اس کی ایک سادہ مگر زبردست دلیل ہے کہ چاہے اس کے الف نون کو زائد سمجھا جائے یا اصلی، کسی صورت میں بھی اس کا مادہ ن، س، ی نہیں ہوسکتا جو نسیان کا مادہ ہے اس لیے اس کو نسیان سے مشتق سمجھنا بداہت کے خلاف ہے۔

جن وانس کی بحث کا فیصلہ:

مفسرین کے اس اختلاف کے بعد معلوم ہوا کہ جن وانسان دو مقابل چیزیں ہیں اور ان کے مادہ اشتقاق سے صریحاً ثابت ہوتا ہے کہ ان کے معنی میں تضاد ہے اور اس لیے جن اور انسان دونوں کو الناس اور انسان کی قسم خیال کرنا نہایت نامعقول ہے کیا انسان کی دو قسمیں ٹھہرانا انسان اور غیر انسان، عقل کے ساتھ کھلی دشمنی نہیں؟

تم کہہ سکتے ہو کہ آیت کریمہ میں الناس کا لفظ استعمال ہوا ہے، لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ اس کی اصل ناس ہے (جو انسان کی جمع ہے) کثرت استعمال اور تخفیف کے لیے بغیر ہمزہ کے استعمال ہونے لگا۔ اس صورت میں قطعاً اس کا مادہ ا، ن، س ہے جو بعینہ انسان کا مادہ ہے لیکن اگر اس کی اصل ناس نہ فرض کی جائے (جو بہت بعید ہے) اور اس کو ایک مستقل لفظ مانا جائے تب بھی اس کا اطلاق بنی آدم پر ہوتا ہے اور جن اس کے مفہوم میں ہرگز داخل نہیں۔

جو لوگوں کا خیال ہے کہ الناس کے مفہوم میں انسان اور جن دونوں داخل ہیں، اس لیے وہ آیت کریمہ میں پہلے الناس کو عام اور دوسرے کو بنی آدم کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں، اس بناء پر

وہ خیال کرتے ہیں کہ الناس کی تقسیم جن اور انسان کی طرف درست ہے، ان کی غلط فہمی کی اصلیت یہ ہے کہ قرآن کریم کی اس آیت میں:

﴿ وَّ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ. ﴾

(الجن:٧٢/٦)

"بے شک بنی آدم کے چند اشخاص جنیوں کے چند اشخاص کے ساتھ پناہ لیتے تھے۔"

جنیوں پر رجال کا اطلاق ہوا ہے جو ان کے خیال میں الناس کے مترادف ہے۔ اس غلط فہمی کا ازالہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں رجال لفظ جنیوں کے لیے بطور مطلق کے استعمال نہیں ہوا بلکہ مقید طور پر استعمال ہوا ہے یعنی رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ کے مقابلہ میں رِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

سیاق کلام:

اس کی مثال یہ ہے کہ پتھر یا لکڑی کی مورت کو ہم کہہ سکتے ہیں:

(هٰذَا اِنْسَانٌ مِنَ الْحِجَارَةِ يَا رَجُلٌ مِّنَ الْخَشَبِ)

لیکن بغیر اضافت اور تقیید کے اس پر انسان یا رجل کا لفظ نہیں بول سکتے۔ نیز سیاق کلام سے صاف واضح ہے کہ الجنة والناس دو مقابلے کے لفظ ہیں اس لیے دونوں پر الناس کا لفظ کس طرح مشتمل ہوسکتا ہے؟

برخلاف اس کے الرجال اور الجن کا لفظ مقابلے کے طور پر استعمال نہیں ہوتے بلکہ ان کی بجائے الجن والانس کہا کرتے ہیں۔ بہر حال یہ قول کہ من الجنة والناس میں من بیانیہ کا تعلق الناس کے ساتھ ہے جو صدور کا مضاف الیہ واقع ہوا ہے، نہایت ضعیف اور مرجوح قول ہے۔

اس کے مقابلہ میں ایک دوسری جماعت مفسرین کی یہ کہتی ہے کہ من الجنة والناس کا لفظ الذی یوسوس کا بیان واقع ہوا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ وسوسہ ڈالنے کا کام دونوں قسم کے شیطان انجام دیتے ہیں۔ وہ شیطان جو جنیوں کی قوم سے ہے اور وہ شیطان جو نوع انسانی کا ایک فرد ہے، یہ دونوں قسم کے شیطان دل میں برے خیالات پیدا کرنے کا ذریعہ

ہیں۔ اگر چہ انسانی شیطان کا القا کان کے ذریعہ سے ہوتا ہے کیوں کہ اس کی بات حرف اور صوت سے ہوتی ہے جس کا تعلق قوت سامعہ کے ساتھ ہے اور جنی شیطان کو اس ذریعہ کی ضرورت نہیں، وہ براہ راست دل میں القا کرتا ہے کیوں کہ اس کو انسان کے باطن میں نفوذ حاصل ہے اور وہ اس کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے جیسے کہ اس سے پہلے اس کے ثبوت میں حدیث صحیح کا حوالہ دیا گیا ہے۔ البتہ بعض اوقات جنی شیطان بھی کسی آدمی کی شکل میں متمثل ہو کر کان کے ذریعہ سے انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے چناں چہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں جو کاہنوں کے بارے میں وارد ہوئی ہے، مفصل ذکر ہے۔ ❶

الغرض ایک دوسرے قول کا ملخص یہ ہے کہ الذی یوسوس کی دو قسمیں ہیں، جن اور انسان۔ یہ دونوں انسان کے دل میں وسوسہ ڈالنے اور شر کے ظہور میں آنے کا باعث ہوتے ہیں۔

﴿ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ﴾ (الانعام:٦/١١٢)

''اسی طرح ہم نے ہر ایک پیغمبر کے لیے انسان اور جن کی نوع سے شیطانوں کو اس کا دشمن بنایا جو ایک دوسرے کی طرف ایسی باتوں کا القا کرتے ہیں جو بظاہر ملمع اور حقیقت میں دھوکہ اور فریب ہوتی ہیں۔''

اس لیے دوسرا قول قابل ترجیح ہے اور اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں پہلے قول کے بموجب اس صورت میں صرف شیاطین الجن کے شر سے پناہ مانگنے کا ذکر ہے لیکن دوسرے قول کی بنا پر دونوں قسم کے شیاطین جن اور انسان کے شر سے پناہ طلب کی گئی ہے، لہٰذا استعاذہ کی جامعیت کے لیے یہی قول زیادہ موزوں ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ احکم.

---

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ صلوٰۃ اللہ علیہم، رقم: ٣٢١٠

شریر انسان پر شیطان کا اطلاق کلام مجید کا عام محاورہ ہے۔ مترجم

فصل نہم

اسباب اور بچاؤ

شیطان کے شر سے بچنے کے دس سبب ہیں۔

پہلا سبب: استعاذہ باللہ:

(۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے شر سے پناہ مانگی جائے۔ قال اللہ تعالیٰ:

﴿ وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ. ﴾ (حم سجدہ: ۴۱/۳۶)

''اگر تم کو شیطان کوئی شر پہنچانا چاہے اور تم کو چھیڑ دے تو تم اللہ کے ساتھ اس کے شر سے پناہ لو۔ بے شک وہی ہے سننے والا جاننے والا۔''

اس سے پہلے کسی مقام پر تم کو بتایا جا چکا ہے کہ سننے سے مراد قبول کرنا ہے۔

علم بیان کے واقف جانتے ہیں کہ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ نہایت ہی مؤکد جملہ ہے، چونکہ اس سے پہلے اس بات کی تلقین کی گئی ہے کہ اپنے دشمن کے ساتھ ایسی نیکی کرو جس سے بہتر نیکی نہیں ہو سکتی اور چونکہ اس پر عمل کرنا نفس پر نہایت شاق گزرتا ہے کیونکہ شیطان اس کے سامنے یہ بات لاتا ہے کہ ایسا کرنا ذلت کی دلیل ہے اور اس سے تمہارے دشمن کو ایذا دہی کی مزید جرأت نہ ہوگی، اس لیے سب سے بہتر تو یہی ہے کہ اس سے اپنا پورا بدلہ لے لو، یا زیادہ سے زیادہ اس کی تعدی سے درگزر کر لو، لیکن اس کے ساتھ نیکی کر کے دشمن کے سامنے اپنے آپ کو عاجز ثابت کرنا اور ذلیل بنانا کچھ شک نہیں کہ موت کے برابر بلکہ اس سے بدتر ہے۔

الغرض نفس پر یہ نہایت سخت گزرتی ہے اس لیے تقاضائے مقام کی وجہ سے اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ کے جملہ کو نہایت مؤکد شکل میں استعمال کیا گیا، سورۂ اعراف میں ہے:

﴿ وَ اِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ. ﴾ (حم سجدہ: ۴۱/۳۶)

اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے آنحضرت کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ جاہلوں سے درگزر کریں، چوں کہ اس پر عمل کرنا پہلے کی طرح شاق نہیں اس لیے اس جملہ کی تاکید ضروری نہیں سمجھ گئی۔

الغرض شیطان کے شر سے بچنے کا پہلا سبب استعاذہ باللہ ہے جس کی بابت ان آیتوں میں ارشاد ہے، نیز صحیح بخاری میں سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں تھا کہ اتنے میں دو شخصوں نے ایک دوسرے کو گالیاں دیں اور ایک کا چہرہ سرخ ہو کر گردن کی رگیں پھول گئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں ایک کلمہ جانتا ہوں اگر وہ کلمہ کہہ دے تو یہ حالت اس کی زائل ہو جائے گی، وہ کلمہ یہ ہے:

((اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.)) [1]

دوسرا سبب، استعاذہ بالمعوذتین:

(۲) ان دونوں سورتوں (سورۂ فلق اور سورۂ ناس) کے پڑھنے پر مداومت کرے، شیطان کے شر سے محفوظ رہنے میں ان سورتوں کے ذریعہ سے استعاذہ کرنا حیرت انگیز طور پر مؤثر ہوتا ہے، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بابت فرمایا ہے کہ استعاذہ میں کوئی ان کے برابر نہیں۔ [2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ ہر رات سوتے وقت ان سورتوں کو پڑھتے تھے۔ [3]

---

1. صحیح بخاری، کتاب الادب، باب ما ینھی من السباب واللعن، رقم:٦٠٤٨
2. سنن نسائی، کتاب الاستعاذۃ، باب ماجاء فی سورتی المعوذتین، رقم:٥٤٤٠۔ سنن دارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فی فضل المعوذتین
3. سنن ترمذی، کتاب الطب، باب ماجاء فی الرقیة بالمعوذتین، رقم:٢٠٥٨۔ سنن نسائی، کتاب الاستعاذۃ، باب الاستعاذۃ من عین الجان، رقم:٥٤٩٦۔ سنن ابن ماجه، کتاب الطب، باب من استرقی من العین، رقم:٣٥١١

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو آپ نے حکم دیا تھا کہ ان کو ہر نماز کے پیچھے پڑھا کرے۔ ❶ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی منقول ہے کہ اگر ہر صبح وشام کو کوئی سورۃ اخلاص اور ان سورتوں کو پڑھا کرے وہ ہر طرح کی آفت اور شر سے بچا رہے گا۔ ❷

تیسرا سبب آیۃ الکرسی کا ورد:

(۳) آیت الکرسی کو اپنا ورد بنالے، صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو سرمایہ کی حفاظت پر مامور فرمایا ایک رات ایک شخص نے آ کر اس اناج کے ڈھیر سے مٹھیاں بھرنا شروع کیں اور جب میں نے اس کو پکڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدمت میں لے جانا چاہا تو اس نے منت سماجت شروع کی اور وعدہ کیا کہ پھر نہیں آؤں گا، اس پر میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ دوسری اور تیسری رات ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور تیسری رات اس نے مجھ سے کہا کہ اگر تو مجھ کو چھوڑ دے تو میں تم کو ایک عمل سکھا دوں گا، چونکہ صحابہ کرام نیکی کرنے اور ثواب حاصل کرنے پر سخت حریص تھے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس شرط پر اس کو چھوڑ دیا اور اس نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ کہا کہ جب تم سونے لگو تو آیت الکرسی پڑھ لو، رات بھر اللہ تعالیٰ شیطان کی طرف سے نگہبان ہوگا اور صبح تک کوئی شیطان تمہارے نزدیک نہیں آئے گا۔

جب اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا یہ قول نقل کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اس نے سچ کہا اگرچہ وہ جھوٹا ہے۔'' ❸

اگر خدا نے چاہا تو ہم ایک مستقل مضمون میں یہ راز بیان کریں گے کہ آیت الکرسی میں خصوصیت سے کیوں یہ تاثیر عظیم رکھی گئی ہے اور اس کے دوسرے اسرار بھی بیان کریں گے۔

---

❶ سنن ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی المعوذتین، رقم:۲۹۰۳

❷ سنن ترمذی، کتاب الدعوات، باب الدعاء عندالنوم، رقم:۳۵۷۵۔ سنن ابو داؤد، کتاب الادب، باب مایقول اذا اصبح، رقم:۵۰۸۲۔ سنن نسائی، کتاب الاستعاذۃ، باب ماجاء فی سورتی المعوذتین، رقم:۵۴۳۰

❸ صحیح بخاری، کتاب الوکالۃ، باب اذا وکل رجلا فترک الوکیل شیئا، رقم:۲۳۱۱

چوتھا سبب: سورۂ بقرہ کا ورد:

(۴) سورۃ البقرہ کا پڑھنا، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''اپنے گھروں کو قبرستان مت بناؤ، اور بے شک جس گھر میں سورۃ بقرہ پڑھی جائے اس میں کوئی شیطان داخل نہیں ہوسکتا۔''❶

پانچواں سبب: سورۃ بقرہ کی اختتامی آیات:

(۵) سورۂ بقرہ کی اختتامی آیتیں:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ...... ﴾ پڑھنا۔

ابوموسی الاشعری رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے:

''جو شخص کسی رات میں سورۂ بقرہ کے خاتمہ کی دو آیتیں پڑھ لے تو وہ اس کے لیے کافی ہیں۔''❷

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک حدیث ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں سے سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں آج نازل ہوئی ہیں۔ اگر ان کو کسی گھر میں تین رات تک متواتر پڑھا جائے تو شیطان اس گھر کے قریب نہیں آئے گا۔''❸

چھٹا سبب: سورۂ حم المومن کی ابتدائی آیات:

(۶) سورۃ حم المومن کی ابتدائی آیتیں اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ تک آیت الکرسی کے ساتھ ملا کر پڑھنا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

❶ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلاۃ النافلۃ فی بیتہ، رقم:۲۱۲/۷۸۰

❷ صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب فضل سورۃ البقرۃ، رقم:۵۰۰۹۔ صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب فضل الفاتحۃ وخواتیم سورۃ البقرۃ، رقم:۲۵۵/۸۰۷

❸ سنن ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی آخر سورۃ البقرۃ، رقم:۲۸۸۲

”جوکوئی ان آیتوں کوصبح کے وقت پڑھے گا وہ شام تک (شیطان کے شر سے) محفوظ رہے گا۔“ ❶

اس حدیث کے راویوں کے حفظ کے متعلق علماء نے بحث کی ہے لیکن اس کی تائید کے لیے آیت الکرسی کی فضیلت میں دوسری روایتیں موجود ہیں۔

ساتواں سبب: مسنون وظیفہ:

(۷) ((لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ.))

سومرتبہ پڑھنا۔ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جوشخص ان کلمات کودن میں سو مرتبہ کہے گا اس کو دس غلاموں کے آزاد کرنے کا ثواب ملے گا اس کے لیے سونیکیاں لکھی جائیں گی اور سو برائیاں اس کے نامہ اعمال سے مٹادی جائیں گی اور دن بھر وہ شیطان کے شر سے امن میں رہے گا اور کسی شخص کو اس کے برابر ثواب نہیں ملے گا ہاں یہ اور بات ہے کہ کوئی اس سے بھی زائد مرتبہ پڑھ لے۔“ ❷

یہ ایک عظیم النفع ،اورجلیل القدر ذکر ہے،اللہ تعالیٰ جس کی مدد فرمائے اس کے لیے اس ذکر کی پابندی کرنا چنداں دشوار نہیں۔

آٹھواں سبب: ذکر الٰہی:

(۸) کثرت سے اللہ تعالیٰ کی یاد میں مصروف رہنا شیطان کا شر دفع کرنے کے لیے مفید ترین حرز جان ہے۔حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

❶ سنن ترمذی، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی سورة البقرة وآية الكرسی، رقم:۲۸۷۹

❷ صحیح بخاری، کتاب الدعوات، باب فضل التهليل، رقم:٦٤٠٣۔صحیح مسلم، کتاب الذکر، باب فضل التهليل والتسبيح والدعاء، رقم:٢٦٩١

"اللہ تعالیٰ نے یحیٰ بن زکریا علیہما السلام کو پانچ باتوں کے بجالانے کا حکم دیا، نیز بنی اسرائیل کو بھی ان کے بجالانے کا حکم دیں۔ حضرت یحیٰ علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل اور تبلیغ میں کسی قدر تساہل کیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اس کو یاد دہانی کرے اور کہہ دے کہ یا تو وہ فوراً اس حکم کی تبلیغ کرے اور پھر بھی سہل انگاری کرے تو عیسیٰ علیہ السلام ان کی تبلیغ کر دے۔ یحیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں کہا کہ میں اس کی تبلیغ کروں گا کیونکہ اگر تم نے مجھ سے پیش دستی کی تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ ناراض ہو کر مجھ کو زمین میں نہ دھنسا دے یا کسی اور عذاب میں مبتلا نہ کر دے۔"

چناں چہ اس نے بیت المقدس میں لوگوں کو جمع کیا یہاں تک کہ وہاں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی اور گیلریاں تک بھر گئیں۔ حضرت یحیٰ علیہ السلام نے ان کو اسی طرح مخاطب کیا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے پانچ باتوں کے بجالانے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ میں تم کو ان کے بجالانے کا حکم دوں۔

حضرت یحیٰ علیہ السلام کو یادگار نصیحت:

(۱) تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ بناؤ، مشرک کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے خالص اپنے مال سے سونا چاندی دے کر ایک غلام خریدا، اس کو رہنے کے لیے مکان دیا اور کام بھی اس کو بتا دیا اور ساتھ ہی اس سے یہ کہا کہ یہ کام کیے جاؤ اور اس سے جو کچھ حاصل ہو وہ مجھ کو ادا کرتے رہو۔ چناں چہ وہ غلام کماتا تھا اور اپنی کمائی ایک دوسرے اجنبی شخص کے حوالہ کرتا جاتا تھا کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے غلام کے اس کام پر خوش ہوگا؟

نماز پڑھو:

(۲) تم نماز پڑھو اور نماز پڑھتے وقت ادھر ادھر مت دیکھو کیونکہ جب تک آدمی کسی دوسری طرف ملتفت نہ ہو اللہ تعالیٰ اس کے منہ کے سامنے رہتا ہے۔

روزہ رکھو:

(۳) روزہ رکھو، اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس کے پاس مشک کی بھری ہوئی

تھیلی ہو اور اس کے ارد گرد ایک جماعت اس کے دوستوں کی موجود ہو، جن کے دماغ اس کی خوشبو سے معطر ہوئے جا رہے ہوں۔ سب لوگ ایسے شخص کی ہم نشینی کو پسند کریں گے؟ اور بے شک روزہ دار کے منہ کی خوشبو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک سے بھی زیادہ خوشبودار ہے۔

صدقہ دو:

(۴) صدقہ دو، اس کی مثال ایک ایسے آدمی کی ہے کہ جس کو اس کے دشمن نے قید کرایا ہو اور وہ اس کی مشکیں کس کر اس کو قتل کرنا چاہتا ہو اور وہ کہہ دے کہ میں اپنا مال تم کو فدیہ دینا چاہتا ہوں۔ اس پر وہ فدیہ لے کر اس کے بند کھول دیں۔

اللہ کی یاد میں مشغول:

(۵) اللہ کی یاد میں مشغول رہا کرو، اس کی مثال ایک ایسے شخص کی ہے جس کا اس کے دشمن نہایت تیزی کے ساتھ تعاقب کر رہے ہیں۔ اتنے میں اس کو ایک نہایت مضبوط قلعہ نظر آ جائے اور وہ اس میں داخل ہو کر پناہ گزیں ہو جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک ایسی چیز ہے جو تم کو شیطان کے شر سے بچائے گی۔

رسول اکرم ﷺ کی نصیحت:

یہ بیان کر کے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"میں بھی تم کو پانچ باتوں کے بجالانے کا حکم دیتا ہوں جن کی بابت مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ سننا اور ماننا جہاد اور ہجرت۔ اور مسلمانوں کی جماعت کو نہ چھوڑنا کیونکہ جو شخص مسلمانوں کی جماعت سے بالشت بھر بھی جدا ہو جائے وہ اسلام کے دائرے سے بالکل باہر نکل جاتا ہے۔ جب تک وہ باز نہ آ جائے۔ اور جو شخص اہل جاہلیت کی طرح فخر و تعلّی کرے وہ جہنم کا ایندھن ہو گا۔"

ایک شخص نے عرض کیا، یا رسول اللہ! چاہے وہ نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا ہو؟

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"چاہے وہ نماز پڑھتا اور روزہ رکھتا ہو، تم کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ لقب سے پکارے جاؤ جس نے تم کو مسلمان اور مومن اور اپنے بندہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔"

بقول ترمذی یہ حدیث صحیح اور حسن ہے اور بقول صحیح بخاری کے مصنف حارث اشعری کو آنحضرت ﷺ کی صحبت کا فخر حاصل ہے۔ ❶

الغرض اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی ایک ایسی چیز ہے جو شیطان کے شر سے انسان کو بچا سکتا ہے۔ سورۂ ناس میں بعینہٖ اس بات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس میں شیطان کو خناس کے لفظ سے موصوف کیا گیا ہے جس کے معنی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جب انسان خدا کو یاد کرتا ہے اور اس کے ذکر میں مشغول ہوتا ہے تو وہ پیچھے کی طرف ہٹ جاتا ہے بلکہ چھپ جاتا ہے لیکن جب انسان اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے تو وہ پھر دل کے قریب پہنچ کر وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔ تم پڑھ چکے ہو کہ شیطان کا وسوسہ ہی تمام نافرمانیوں اور گناہوں کی جڑ ہے۔ بہر حال شیطان کے شر سے بچنے کے لیے اس سے بہتر نسخہ نہیں کہ انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رکھے۔

نواں سبب: غصہ کو ضبط کرنا:

(۹) شیطان کے شر سے بچنے کا ایک بڑا ذریعہ وضو اور نماز ہے۔ خصوصاً جب قوت غصبیہ یا شہوت کا شدت سے ظہور ہو۔ غضب بمنزلہ آگ کے ایک شعلہ کے ہے جو انسان کے دل میں بھڑک اٹھتا ہے۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"بے شک غصہ انسان کے دل میں آگ کا ایک شعلہ ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ غصہ کی حالت میں اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور اس کی گردن کی رگیں

---

❶ سنن ترمذی، کتاب الامثال، باب ماجاء فی مثل الصیام و الصلاۃ و الصدقۃ، رقم:۲۸۶۳۔

پھول جاتی ہیں؟ اس لیے جو کوئی غصہ کی حالت کو محسوس کرے اس کو زمین کے ساتھ چمٹ جانا چاہیے۔"❶

ایک دوسری حدیث میں ہے:

"شیطان کی پیدائش آگ سے ہے اور بے شک آگ کو پانی سے بجھایا جاتا ہے۔"❷

پانی کے استعمال کا بہترین طریقہ وضو ہے، وہ غصہ کے جوش کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

اس کے بعد اگر آدمی خشوع وخضوع اور حضور قلب کے ساتھ نماز پڑھ لے تو اس کا اثر بالکل زائل ہو جاتا ہے اور بجائے اس کے کہ اس کی تائید میں کوئی دلیل ڈھونڈی جائے اس کا تجربہ کرنا بہتر ہوگا۔

دسواں سبب: فضول اور لغو سے احتراز:

(۱۰) بے ضرورت اور فضول دیکھنے، بے ضرورت بات کرنے، ضرورت سے زائد کھانے اور لوگوں کے ساتھ زائد میل جول رکھنے سے بچنا، کیوں کہ انھی چار باتوں میں بے احتیاطی کرنے کا نتیجہ شیطان کا تسلط ہوتا ہے اور شیطان اپنے اغراض میں انھی کے ذریعہ سے کامیاب ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی نظر کو آزادانہ استعمال کرے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی خوبصورت عورت یا لونڈا اس کے دل میں گھر کر لے اور رفتہ رفتہ اس کے قوائے فکریہ اور توجہ کا مرکز بن جائے اور دین و دنیا کے کام سے اس کو بے کار کر دے:

﴿ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ. ﴾

نظر کو بے لگام چھوڑنے سے بڑے بڑے فتنے پیدا ہوئے ہیں، آنحضرت ﷺ کا یہ قول تجربہ سے نہایت درست معلوم ہونے لگتا ہے کہ نظر شیطان کا ایک زہر آلود تیر ہے، اس لیے جو شخص اپنی آنکھوں کو جھکائے رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایک ایسی علامت پیدا کر دے گا

---

❶ سنن ترمذی، کتاب الفتن، باب ما اخبر النبی اصحابه بما هو کائن الی یوم القیامة، رقم: ٢١٩١۔ مسند احمد (٦١،١٩/٣) رقم: ١١١٤٣

❷ سنن ابو داؤد، کتاب الادب، باب ما یقال عندالغضب، رقم: ٤٧٨٤

جس سے وہ قیامت تک محروم نہیں ہوگا۔"❶

ایک شاعر نے نہایت خوب کہا ہے۔

کل الحوادث مبداء من النظر
ومعظم النار من مستصفر الشرر
کم نظرة فتکت فی قلب صاحبها
فتک التهام بلا قوس ولا وتر

"تمام فتنوں کی ابتداء نظر سے ہوتی ہے (اس سے مراد عشق اور وصل وہجر کے مناظر ہیں) اور چھوٹی چھوٹی چنگاریوں سے عظیم الشان آگ بھڑک اٹھتی ہے (بجا طور پر نظر کو چنگاری سے اور مابعد کے مراحل عشق اور اس کے لوازم وعواقب کو بھڑکتی ہوئی آگ سے تشبیہ دی ہے) بہت مرتبہ نظر دل کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے، لیکن اس کا مہلک تیر کمان اور چلہ کا محتاج نہیں۔"

در دن سینۂ من زخم بے نشاں زدہ
بحیر تم کو عجب تیر بے کماں زدہ

الغرض فضول اور بے ضرورت نظر بلا داشوب کی جڑ اور بعض صورتوں میں دین ودنیا کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔

اسی طرح کثرت کلام اور بے ضرورت بکواس شر کے لیے متعدد درواز ے کھول دیتا ہے جس میں سے شیطان کو داخل ہونے کا موقع ملتا ہے لیکن کم گوئی اس کے تمام مداخل کو بند کر دیتی ہے، تم نے دیکھا ہوگا کہ ایک ہی کلمہ کے لیے بے احتیاطی کے ساتھ منہ سے نکل جانے پر خونریز لڑائیاں تک نوبت پہنچی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو زبان کے روکے رکھنے کی ہدایت فرما کر یہ

---

❶ مستدرك حاكم(٤/٣١٣،٣١٤)

اشارہ فرمایا تھا کہ لوگوں کو منہ کے بل دوزخ میں گرانے کا باعث ان کی اپنی زبان کی کاٹی ہوئی فصل ہے۔ ❶

ایک صحیح حدیث میں ہے کہ بعض اوقات انسان بے ساختہ اپنے منہ سے کوئی کلمہ نکال دیتا ہے، اس کے انجام کی وہ چنداں پروانہیں کرتا اور اس کے سبب سے وہ ستر سال تک جہنم میں غوطے کھاتا رہتا ہے۔

ترمذی میں ہے کہ صحابہ میں سے ایک شخص کا انتقال ہوا تو ایک صحابی نے اس کو جنتی کہا جس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''تمھیں کیا معوم ہے، شاید اس نے کبھی فضول گوئی کی ہو یا کسی ایسی چیز کے دینے میں بخل کیا ہو جس کے دینے میں اس کا کچھ نقصان نہیں ہوتا تھا۔'' ❷

اس میں شک نہیں کہ اکثر گناہوں کی ابتداء فضول نظر اور فضول کلام سے ہوتی ہے، انسان پر شیطان کا تسلط حاصل کرنے کا ایک بڑا ذریعہ یہی ہے، کیوں کہ آنکھ اور زبان دو ایسی چیزیں ہیں جو تقریباً ہر وقت اپنے کام میں لگی رہتی ہیں اور ان کی خواہش کا پیمانہ کبھی لبریز نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے پیٹ بھر جائے تو پھر اس کو تسکین ہو جاتی ہے، علی ہذا القیاس دوسرے قوائے اور اعضاء۔ اس لیے آنکھ اور زبان کے استعمال میں بہت خطرہ ہے، سلف صالحین نے ان دونوں کے حد ضرورت سے تجاوز کر جانے کو سخت خطرناک بتایا ہے۔ ان کا قول ہے کہ زبان کو عموماً حبس میں رکھنا ضروری ہے۔ دوسرے اعضاء اس قدر سرکش نہیں۔ ضرورت سے زائد کھانا بھی بہت سے شرور کا باعث ہے کیونکہ سیر شکمی سے اعضاء اور جوارح میں گناہ کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے اور انسان عبادت کے کرنے میں سست ہو جاتا ہے بسا اوقات اسی کی وجہ سے انسان بڑے بڑے ثوابوں سے محروم رہتا ہے۔

---

❶ سنن ترمذی، کتاب الایمان، باب ماجاء فی حرمة الصلاة، رقم:٢٦١٦۔ مسند احمد(٢٣١/٥) رقم:٢٢٠١٦

❷ سنن ترمذی، کتاب الزهد، باب من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه،رقم:٢٣١٦

پیٹ بھر کے کھانا:

لہٰذا جو شخص پیٹ کے شر سے بچا رہے سمجھ لے کہ وہ ایک بڑے شر سے محفوظ رہا، شکم سیری کی حالت میں شیطان کو نسبتاً زیادہ غلبہ ہو سکتا ہے۔اس لیے بعض آثار میں ہے:

''شیطان کے نفوذ کو روزہ کے ذریعہ کم کرو۔''

''آدمی نے کوئی ایسا برتن نہیں بھرا ہے جس کا بھرنا پیٹ کے بھرنے سے زیادہ برا ہو۔''[1]

پیٹ کے بھرنے کی یہی ایک خرابی کافی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے۔آپ جانتے ہو کہ انسان ایک گھڑی بھی اللہ کی یاد سے غافل ہو تو شیطان اس کے دل کو جونک کی طرح چمٹ جاتا ہے، اور انواع واقسام کے وسوسے ڈال کر اس کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ کیوں کہ شکم سیری کی حالت میں انسان کی نفسانی خواہشوں کو تحریک ہوتی ہے اور شیطان اس پر جلدی قابو حاصل کر سکتا ہے۔لیکن پیٹ بھرا ہوا نہ ہو تو اس کی خواہشات میں چنداں اضطراب پیدا نہیں ہوتا اس لیے شیطان کو اسکے بہکانے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔

فصل دھم

مخالطت

معانی:

لوگوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ میل جول رکھنا، یہ لاعلاج بیماری ہے جس کی بدولت کتنی نعمتیں سلب ہوئیں، کتنی دشمنیاں پیدا ہوئیں، کتنے کینے دلوں میں جاگزیں ہوئے۔ الغرض مخالطت میں دین ودنیا کا نقصان ہے، انسان کو چاہیے کہ کسی کے ساتھ ضرورت سے زائد میل جول نہ رکھے۔(جس کو آئندہ ہم اختصار کے لیے مخالطت سے تعبیر کریں گے)

---

[1] سنن ترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی کراھیة کثرة الاکل، رقم: ۲۳۸۰۔ مسند احمد(۱۳۲/٤)رقم:۱۷۱۸٦

لوگوں کی قسمیں:

مخالطت کے لحاظ سے لوگوں کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جن میں اگر اس نے تمیز کرنا چھوڑ دیا تو یقیناً وہ شر میں مبتلا ہوگا۔

پہلی قسم بہ منزلہ غذا:

لوگوں کی ایک قسم تو وہ ہے جن کے ساتھ میل جول رکھنا بہ منزلہ غذا کے ہے، وہ اس لیے کہ ان کے ساتھ میل جول رکھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک اور سنت رسول ﷺ کا عالم بنایا ہے اور اس کے دشمن شیطان کی فریب کاریوں سے واقف ہیں اور امراض قلوب کے ماہر۔ ایسے لوگوں کے ساتھ میل ملاپ رکھنے میں سراسر نفع ہے، لیکن ان کا وجود کبریت احمر سے بھی زیادہ کمیاب ہے۔

دوسری قسم بمنزلہ ادویہ:

دوسری قسم وہ ہے جس کی مثال ادویہ کی ہے کہ جب تک تندرست ہو تم کو اس کی مطلق ضرورت نہیں، البتہ مرض کی حالت میں بقدر ضرورت اس کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ تمہارے دنیوی اغراض وابستہ ہیں کیونکہ انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے، اس لیے وہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے دوسروں کے ساتھ تعلقات رکھنے پر مجبور ہے۔ اس قسم کے آدمی کے ساتھ میل جول رکھنے میں اس زریں اصول پر عمل پیرا ہونا چاہیے:

(الضروری یتقدر بقدر الضرورة)

”جو بات کسی خاص ضرورت کی وجہ سے اختیار کی جائے وہ ضرورت کی حد تک محدود رہتی ہے۔“

تیسری قسم بہ منزلہ مرض:

تیسری قسم وہ ہے جن کے ساتھ میل جول رکھنا بہ منزلہ مرض کے ہے، جس طرح بیماریوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض ان میں سے مہلک اور بعض صحت کو برباد کرنے والی ہوتی ہیں، اسی طرح ان لوگوں کی مضر صحبت کا مختلف اثر ہوتا ہے۔ بعض کی مثال لاعلاج بیماری اور مرض مزمن

کی ہے جس کا انجام ہلاکت ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کی صحبت میں تم کوئی دینی یا دنیاوی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے بلکہ الٹا ان کی صحبت، دین ودنیا کا نقصان ہے۔ ان کی مخالطت مرض الموت کا حکم رکھتی ہے۔ بعض کی مثال داڑھ کے درد کی ہے کہ جب تک داڑھ نکال نہ ڈالو آرام نہیں ملے گا، بعض ان میں سے روح کے لیے تپ کا حکم رکھتے ہیں۔ یہ وہ گراں جان اشخاص ہیں جن کو نہ تو بات کرنے کا سلیقہ ہے کہ جس کو سن کر تم کو کسی قسم کا فائدہ ہو اور نہ وہ خاموش رہ کر تمہارا کلام سننے کی تکلیف گوارا کرتے ہیں تا کہ ان کو تم سے فائدہ ہو، ان کو اپنی حیثیت کی بھی پہچان نہیں۔ اس لیے کہ وہ خود پسند واقع ہوئے ہیں۔ جب وہ بات کرتے ہیں تو ان کے منہ سے ''پھول جھڑتے ہیں''[1] اور جب وہ چپ رہتے ہیں تو ان کا وجود ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تمہارے سینہ پر چکی کا پاٹ رکھا ہے۔

ایک دن میں نے اپنے شیخ (علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ) کے پاس اس قسم کا ایک آدمی بیٹھا ہوا دیکھا تو آپ نے فرمایا: ''چوتھیا تپ'' ہے، اس کے بعد آپ نے فرمایا، ہماری طبیعتیں اس ناگوار بوجھ کو برداشت کرتے کرتے اب اس کو ہلکا سمجھنے لگی ہیں۔ دنیا کے دیگر مصائب وآلام میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس قسم کے شخص یا اشخاص کے ساتھ آدمی کو واسطہ پڑے اور لزوماً ان کے ساتھ میل جول رکھنا پڑے تو ایسی حالت میں انسان کو چاہیے کہ ان کے ساتھ بہت اچھی طرح سے پیش آئے اور اپنی خوش اخلاقی کو نہ چھوڑے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس بلا سے مخلصی عنایت فرمائے۔ وَهُوَ عَلٰى مَايَشَآءُ قَدِيْرٌ.

چوتھی قسم: بہ منزلہ ہلاکت:

چوتھی قسم وہ ہے جس کے مخالطت کا نتیجہ قطعی ہلاکت ہو، ان کی مثال زہر کی ہے۔ اس لیے اگر کسی کی خوش نصیبی سے اس کو تریاق مل جائے تو زہے سعادت ورنہ معاملہ سخت ہے۔ اس سے

---

[1] اصل کتاب میں تو کچھ اور لکھا ہے۔ فافہم۔ مترجم

مقصد اہل بدعت وضلالت ہیں جو لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی سنت کریمہ کے اتباع سے روکتے ہیں۔ بدعت اور خلاف سنت کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں۔ سنت ان کی نظر میں بدعت ہے اور بدعت سنت، معروف کو منکر اور منکر کو معروف سمجھتے ہیں۔

اگر تم خدائے پاک کی خالص توحید بیان کرو تو وہ کہتے ہیں کہ تم نے اولیاء اللہ کی شان گھٹادی اور تم خالص سنت کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ تم امامان دین کے دشمن ہو۔ اگر تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے کلام اور نبی کریم ﷺ کی حدیث کی طرف بلاؤ تو وہ تم کو مفتن خیال کریں گے اور اگر تم ان سے تمام تعلقات کو منقطع کر کے ان کو دنیائے مردار پر گرتا ہوا چھوڑ دو تو تم کو اہل تلبیس ہونے کی تہمت دیں گے۔

لیکن یاد رکھو کہ اگر تم نے ان کو راضی رکھنے کا خیال کر کے ان کی نفسانی خواہشوں اور بدعت آرائیوں کی پیروی اختیار کی تو تم آخرت میں خاسرین کے زمرہ میں داخل ہوں گے۔ بایں ہمہ وہ بھی ہرگز تم سے راضی نہیں ہوں گے بلکہ تم کو منافق کہیں گے۔ اس لیے میں تم کو نہایت مؤکد نصیحت کرتا ہوں کہ تم ان کے ناخوش ہونے کی کچھ بھی پرواہ نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کرنے میں کوشاں رہو:

﴿ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ (التوبہ:۹/ ۶۲)

”اگر وہ درحقیقت مومن ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کرنا سب سے مقدم ہے۔“

تم کو ان کی مدح وذم پر مطلق التفات نہیں کرنا چاہیے اور اپنی دھن میں لگا رہنا چاہیے۔

ایک شاعر نے کیا ہی اچھا کہا ہے۔

وقد زادني حبا لنفسي انني
بغيض الى كل امرء غير طائل

”مجھے اپنی قدر اس سے معلوم ہوئی کہ فضول اور بیہودہ لوگ مجھ کو اپنا دشمن خیال کرتے ہیں۔“

واذا اتتک مذمتی من ناقص

فھی الشھادۃ لی بانی فاضل

''اور جب ایک ناقص شخص نے تیرے پاس میری مذمت کی تو سمجھ لے کہ یہی میرے فاضل ہونے کی شہادت ہے۔''

وفقنا اللہ تعالیٰ مرضاہ ، آمین.

والحمد للہ تعالیٰ اولا وآخرا وظاھرا وباطنا.

☆☆..........☆..........☆☆

ہماری کتب













